# مجلس ادارت

۱. مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲. ڈاکٹر نذیر احمد

۳. ضیاء الدین اصلاحی

---

## معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے

فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

* سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

**DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY**
**AZAMGARH**

* رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائیگی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔



جلد ۱۶۴ ماہ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۹ء عدد ۲

## فہرست مضامین



---

# شذرات

## "ملک وملت کا مسیحا نہیں رہا"

بالآخر وہی ہوا جس کا کھٹکا مہینوں سے لگا تھا اور اس مسیحا نفس نے اپنی جان جان آفریں کو سپرد کردی، جس کی مسیحائی سے لاکھوں نے زندگی پائی تھی، حق یہ ہے کہ حکیم عبدالحمید کی وفات پر بھی وہی الفاظ دہرائے جائیں جو مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کی وفات پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تحریر فرمائے تھے۔ "حکیم صاحب کی وفات خاندان کا ماتم نہیں، دلی کا ماتم نہیں، قوم کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے، اخلاق و شرافت کا ماتم ہے، سنجیدگی و متانت کا ماتم ہے، عقل و رزانت کا ماتم ہے، آزادی و حریت کا ماتم ہے، اخلاق و ایثار کا ماتم ہے، ہندوستان اور مسلمانان ہند کے طالع و بخت کا ماتم ہے ع

مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا"

حکیم عبدالحمید کا دائرہ فیض و خدمت بہت وسیع تھا، ان سے پورا ملک مستفیض ہورہا تھا۔ ہمدرد کی دوائیں سکۂ رائج الوقت کی طرح گھر گھر پھیلی ہوئی ہیں اس لئے آج سب ہی اس محسن اعظم کی جدائی پر اشک بار اور ماتم کناں ہیں۔ ع

عمت فواضلہ فعم مصابہ

حکیم صاحب جس بدنصیب ملت کے فرد فرید تھے اس میں بڑا قحط الرجال ہے، وہ تنہا اپنی ذات سے ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک جماعت اور ایک قوم تھے، ان جیسے پیکر صدق و اخلاص اور سراپا خدمت و عمل کا اٹھ جانا عجب سانحہ اور ملت اسلامیہ کا زبردست خسارہ ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی تلافی کیسے ہوگی اور اس غم کا مداوا کیا ہوگا۔ بلاشبہ وہ اس عہد کے مسیح الملک، ابن سینا و رازی تھے۔

حکیم عبدالحمید کا خاندان تجارت پیشہ تھا۔ یہ چینی ترکستان کے شہر کاشغر سے پشاور، ملتان، دہلی، پانی پت اور پیلی بھیت ہوتا ہوا ان کے دادا کے زمانے میں دہلی میں آباد ہوا، حکیم صاحب کے پدر بزرگوار حکیم عبدالمجید کی ولادت پیلی بھیت میں ہوئی تھی مگر پرورش و پرداخت دہلی میں ہوئی، بڑی مشکلات جھیلنے کے بعد وہ ہمدرد کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوئے تھے، لیکن ابھی چالیس ہی کے پیٹے میں تھے اور ہمدرد کو بلند دواخانہ بنانے کی جد و جہد کر رہے تھے کہ ۲۱/ مارچ ۱۹۲۲ء کو ان کا وقت آخر آگیا۔ ان کے بڑے صاحب زادے عبدالحمید اس وقت ۱۴ سال کے تھے اور طبیہ کالج میں زیر تعلیم تھے، یہ ۱۴/ ستمبر ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے تھے، پیدائش کے وقت فضا ڈاکٹر اقبال کے ان شعروں سے گونج اٹھی ہوگی۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد  حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور  خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد



والد کی وفات کے بعد نہایت روح فرسا اور ولولہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے جلد ہی حالات پر قابو پالیا اور اپنی ساری قوت و توانائی صرف کرکے ہمدرد کو بام عروج پر پہنچا دیا اور ان کی فطری اور خداداد صلاحیتوں نے اسے والد کے تصور و خیال سے بھی بہت آگے بڑھا دیا۔

حکیم عبدالحمید کی یادگار اگر تنہا ہمدرد دواخانہ ہی ہوتا تو وہ ان کی عظمت، شہرت، نیک نامی اور ہندوستانی قوم کے فخر کے لئے کافی ہوتا مگر ان کی ہمت عالی نے دریا بھی قبول نہیں کیا اور ان کی قوت پرواز نے ستاروں سے آگے اور جہاں بھی تلاش کرلئے۔ چنانچہ ہمدرد وقف لیبورٹریز دہلی کے ماتحت مختلف سوسائٹیاں اور انسٹی ٹیوٹ قائم کردیئے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن انڈیا۔ ہمدرد طبی کالج۔ مجیدیہ ہسپتال، ہمدرد کالج آف فاریسی، جامعہ ہمدرد، غالب اکیڈمی، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ سینٹر فار ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف فیڈرل اسٹڈیز، بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو، ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی، ہمدرد پرائمری اسکول، ہمدرد پبلک اسکول، ہمدرد اسٹڈی سرکل، رابعہ گرلس اسکول، رفیدہ نرسنگ اسکول، ہمدرد کوچنگ سینٹر وغیرہ ان کی کوہ کنی اور خار اشگافی نے تغلق آباد کے کھنڈروں پر ایک نیا جہاں آباد کردیا، یہیں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی شاندار لائبریری، حسین و جمیل مسجد، کنونشن سینٹر، ہاسٹل، اسکالرز ہاؤس، اسٹاف کوارٹرس، گیسٹ ہاؤس، کین ٹین سب ہیں۔ اتنے سارے شعبے کئی کئی افراد اور ادارے تو درکنار حکومتیں بھی نہیں قائم کرسکتیں جو تن تنہا حکیم عبدالحمید کی سعی پیہم سے وجود میں آگئے ہیں۔

حکیم عبدالحمید کا خاص میدان عمل فن طب تھا۔ جس کی تجدید، احیا اور نشاۃ ثانیہ ان کا مشن تھا، وہ ہندوستان کے طبیب اعظم اور اس فن کے مجدد تھے، شریفی اور عزیزی خاندانوں کے اہل کمال کے خاتمے کے بعد آزاد ہندوستان میں ان ہی کی فراست، ذہانت اور حذاقت نے مخالف ہوا میں بھی طب یونانی کا چراغ روشن رکھا، ان کے مجتہدانہ دماغ نے دور حاضر کے معیار و مذاق اور ضرورتوں و تقاضوں کے مطابق سائنٹفک دوائیں ایجاد کرکے طب یونانی کو موجودہ دور سے ہم آہنگ کردیا۔ ان کے عزم و استقلال، جوش خدمت، مطب کی پابندی، فن کے ساتھ دیانت و ایمانداری، صفائی اور صحت وزن کے ساتھ اعلیٰ ادویہ کی تیاری اور خوش معاملگی نے ان کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ طب کے فروغ کے لئے خود بھی طبی ادارے اور تحقیقاتی مراکز قائم کئے اور ملک کے کسی گوشے میں اس کے جو ادارے قائم ہوئے، بھی ان کی توجہ کا مرکز رہے، گوناگوں مشغولیتوں اور کبر سنی کے باوجود ان اداروں کے پروگرام میں شریک ہوتے اور کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ۱۹۵۲ء سے وفات تک آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے صدر رہ کر بھی طب کی ترقی کا سامان کرتے رہے۔ سنٹرل کاؤنسل آف ریسرچ ان یونانی میڈیسن اور بہت سے میڈیکل اداروں کی

مسند صدارت کو بھی اسی لئے رونق بخشی۔ ان کو طبیہ کالج کے فارغین کا یہ طرز عمل پسند نہیں تھا کہ وہ یونانی طریقہ علاج چھوڑ کر ایلو پیتھک میں پریکٹس کریں۔

تعلیم کا فروغ بھی حکیم صاحب کی جد و جہد اور سرگرمی کا ایک میدان رہا ہے، جناب سید حامد کا یہ خیال بجا ہے کہ انفرادی طاقت تعلیم اور صحت سے بنتی ہے، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر نے پہلے صحت کی طرف دھیان دیا اور بعد میں تعلیم کی طرف، یونانی طب کو جو روبہ زوال تھی طاقت پہنچائی اور یونانی دواؤں کو جن کی دستیابی اور تیاری دونوں دشوار ہو چکی تھیں معیار بندی اور تجدید سے اعتبار عطا کیا، دواؤں کی فروخت سے جو یافت ہوئی اس کا بیشتر حصہ تعلیم اور روزگار کی مدوں میں لگا دیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے اور دوسرے ہم وطنوں کی طرح انکو آگے کرنے کے لئے حکیم صاحب نے مختلف منصوبے اور اسکیمیں بنائیں۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی عصری درس گاہوں کے ہونہار طلبہ کو قرض وظیفے دیتی ہے۔ ہمدرد کوچنگ سینٹر میں سول سروسز کے امتحان کی تیاری کا سلسلہ شروع کیا تاکہ مسلمان طلبہ کے لئے بھی ملازمتوں کے در کھلیں، ایجوکیشن سروے اعداد و شمار کی فراہمی کر کے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی ختم کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ حکیم صاحب قدیم علوم کے وارث اور مشرقی تہذیب کے پروردہ ہونے کے باوجود جدید سائنس کے علمبردار تھے، ان کا ذہن روشن اور فکر وسیع تھا، وہ نہ مشرق سے بیزار تھے اور نہ مغرب سے حذر کرتے تھے، ان سے دینی اداروں اور جدید تعلیم گاہوں دونوں کو فیض پہنچا مگر وہ دینی مدارس کی اس روش "آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ چلنا" سے مطمئن نہیں تھے وہ ان کو جامعۃ الہدایت جے پور کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیتے تھے۔

مختلف طبی، علمی اور تعلیمی اداروں سے حکیم صاحب کا گہرا تعلق تھا اور ہر ایک کو انہوں نے فائدے بھی پہنچائے، ۱۹۶۶ء میں الکشن کے بغیر متفقہ طور پر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی چانسلر کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا جو بڑے فخر و اعزاز کی بات ہے۔ شروع ہی سے ان کو دارالمصنفین سے بڑا لگاؤ تھا، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے معزز رکن تھے، کبھی کبھی اس کے جلسوں میں بھی تشریف لاتے تھے، دو ایک بار ان کی سہولت کے خیال سے ہمدرد نگر ہی میں اس کا جلسہ ہوا، آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا چھٹا اجلاس ۳۰، ۳۱ / دسمبر ۱۹۶۹ء کو دارالمصنفین میں ہوا اس کی صدارت کے لئے ان کا نام تجویز کیا گیا تو دارالمصنفین سے تعلق کی بنا پر منظور کر لیا جیسا کہ فرماتے ہیں "اس صدارت سے آپ کو کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو مجھے یہ سعادت ضرور حاصل ہو گئی کہ اس بہانے اعظم گڈھ حاضر ہونے کا موقع مل گیا جو علوم اسلامیہ کی تحقیق کا ایک پرانا اور اہم مرکز ہے۔ جو علامہ شبلی نعمانیؒ جیسے فاضل روزگار کا وطن اور ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا ایک میدان رہا ہے اور جو دارالمصنفین جیسے ادارہ کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے



ہے جسے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے اور جو اب بھی بہت سے علماء و فضلاء کا مرکز ہے، مجھے دارالمصنفین میں حاضری سے اس لئے بھی خوشی ہوئی ہے کہ اس کی مطبوعات سے مجھے ۱۹۲۴ء سے ہی دلچسپی رہی ہے، معارف کے پرانے پرچے میں نے اسی سال یہاں سے منگوا کر مجلد کرائے تھے اور اس وقت سے اب تک میرا اس ادارہ سے تعلق ہے"۔ اس خطبہ میں اعظم گڑھ سے بھی والہانہ تعلق اور بہت سی مفید باتوں کا ذکر ہے جس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔

غیر علمی مشاغل میں شب و روز منہمک رہنے کے باوجود حکیم صاحب علم و فن کے دل دادہ اور مطالعہ و کتب بینی کے حریص تھے، ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے ہاتھ میں کتاب و قلم پکڑ لیا تھا، علم و ادب اور مطالعہ و تحقیق ان کی گھٹی میں شامل تھے، ہر قسم کی چیزیں طب، سائنس، ادب و اسلامیات، تاریخ و تذکرہ کی کلاسیکل اور تازہ ترین تصانیف اور تحقیقی رسائل ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں اور وہ مشرق و مغرب کی جدید طبی و علمی تحقیقات سے برابر باخبر رہتے تھے، بڑھاپے میں بھی ان کی تحقیق و جستجو میں کمی نہیں آئی تھی، ہر وقت جاننے اور سیکھنے کی امنگ رہتی تھی۔ یورپ کے کئی سفر اس کے لئے اور وہاں کے نوادر دیکھنے کے لئے کئے تھے۔ صبح سویرے ملک کے قومی سطح کے انگریزی اور اردو اخبارات اور ملکی و غیر ملکی رسائل اور میگزین کا مطالعہ کرتے تھے اور ان کے مخصوص مضامین اور خبروں پر نشانات لگا کر متعلقہ شعبہ کو ان کے تراشے کاٹنے کے لئے بھیج دیتے اور یہ ہدایت بھی فرما دیتے کہ یہ تراشے کس نام کے فائل میں رکھے جائیں۔ اس طرح ملک اور مسلمانوں کے اہم مسائل کے متعلق مختلف عنوانات پر سینکڑوں ضخیم فائلیں تیار ہو گئیں جو سنہ وار مرتب ہو کر جامعہ ہمدرد کی مرکزی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ میری ایک کتاب قرآنیات پر پاکستان سے شائع ہوئی تھی، میں نے یہ جاننے کے باوجود کہ حکیم صاحب کو مطالعہ کا موقع کہاں ملتا ہوگا انہیں پیش کی تھی، چند روز بعد ڈاک سے ان کا گرامی نامہ ملا، جس میں میری حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے ایسی باتیں تحریر تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے پوری کتاب ملاحظہ فرمالی ہے۔ میں نے اپنے مخدوم بزرگ جناب مالک رام صاحب سے عرض کیا کہ آخر حکیم صاحب کب پڑھتے لکھتے ہیں، انہوں نے بتایا کہ ان کے مطالعہ کے مخصوص دن ہیں، ان دنوں میں کسی سے ان کی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ خواجہ حسن نظامی ثانی صاحب ایک روز ان سے ملنے لال کنویں والے دفتر پہنچے وہ اس وقت تنہا چھت پر ایک چھوٹے سے تپتے ہوئے سائبان کے نیچے لکڑی کے ایک معمولی سے تخت پر بیٹھ کر جس پر ایک ٹاٹ کی بوری بچھی ہوئی تھی محو مطالعہ تھے۔

حکیم صاحب کے تحریری و تصنیفی کاموں میں ابن سینا کی شہرہ آفاق کتاب القانون فی الطب ہے جس کا صحیح نسخہ تیار کر کے تحقیق و تدوین کے بعد شائع کیا، اس پر ان کا عربی مقدمہ ہے، یہ پانچ جلدوں

میں ہے، چھٹی جلد میں مصطلحات ولغات کا تذکرہ ہے، ایک جلد کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کرایا، ابن سینا کی دوسری اہم طبی تصنیف الادویۃ القلبیۃ کے ایک نسخہ کو بنیاد بنا کر انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا۔ اس کے شروع میں طب یونانی کے پس منظر پر بعض اہل قلم سے محققانہ مقالات لکھوائے۔ آل انڈیا طبی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ۵۲ء سے ۹۴ تک جو صدارتی خطبات دیئے تھے انہیں ڈاکٹر خاور ہاشمی نے "خطباتِ حمید" کے نام سے مرتب کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مکتوبات تصوف (فارسی) کا اردو ترجمہ ایک صاحب کو اعزازیہ دے کر کرایا۔ متعدد انگریزی کتابیں بھی تالیف کیں یا اپنی نگرانی میں کرائیں، ان کا ایک تحریری میدان طبی و سائنسی صحافت بھی تھا۔ ہمدرد صحت کے وہ برسوں مدیر رہے، جس کے کئی اہم خاص نمبر نکالے، پندرہ روزہ ہمدرد بھی ان کی ادارت میں نکلا، کئی انگریزی میگزین بھی شائع کئے جن میں سہ ماہی اسٹڈیز ان ہسٹری آف میڈیسین اینڈ سائنس اور اسٹڈیز ان اسلام زیادہ مشہور ہیں۔ حکیم صاحب کی تحریر ماقل و مادل ہوتی تھی۔ وہ کم سے کم لفظوں میں اپنا مدعا پوری طرح واضح کر دیتے تھے۔ حکیم صاحب نے صلہ و ستائش سے بے پروا ہو کر علم و فن کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں ان کے اعتراف میں انہیں پدم شری اور پدم بھوشن کے قومی اعزاز عطا کئے گئے۔ سویٹ روس سے ابن سینا اوارڈ، ہمدرد یونیورسٹی کراچی نے اعزازی اوارڈ اور ڈی لٹ دیا اور ایرانی نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے اعزازی ممبر تھے۔ اردو کے مشہور اہل قلم مالک رام نے ان کی خدمات کے اعتراف میں "نذر حمید" مرتب کی۔

حکیم صاحب دین دار اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن ان میں توسع اور وسیع المشربی تھی، ہر مسلک و عقیدہ اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے اور وہ مسلمانوں کے تمام طبقوں میں مقبول اور غیر مسلموں کے بھی معتمد تھے، ان کی سیرت کا سب سے اعلیٰ جوہر خلق خدا کی خدمت اور نفع رسانی تھا، بڑی دلکش صفات و خصائل کے مالک تھے، دولت کی فراوانی اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان میں بلا کی سادگی اور انکسار تھا، ان کی اپنی ذات پر ۱۰۰/ روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہ ہوتا لیکن دوسروں پر خرچ کرنے میں حاتم تھے، قومی اور تعلیمی امور پر بے دریغ خرچ کرتے، صبر و قناعت کے خوگر تھے، بناوٹ اور تکلفات سے ان کی زندگی بری تھی، لباس، رہن سہن اور کھانے پینے میں بڑی سادگی تھی۔ کمرے میں نہ دری نہ چاندنی اور نہ ایرکنڈیشنر لگایا۔ پنکھے کے بھی عادی نہ تھے، سخت ٹھنڈک میں ہیٹر نہ استعمال کرتے، صبح ٹھنڈے پانی سے نہاتے، ۸۰ برس کی عمر میں سید شہاب الدین دسنوی صاحب نے اس کے لئے کہا تو فرمایا کہ بوڑھا ہوں گا تو گرم پانی سے نہاؤں گا، کپڑے میں پیوند لگے ہوتے، اپنا رومال، بنیان اور موزے وغیرہ خود ہی دھو لیتے، بہت پرانے کپڑے اور جوتے ان کے استعمال میں رہتے۔ عرصے سے نئے کپڑے اور جوتے نہیں خریدے تھے کہ جو ہیں وہی عمر بھر کام دے دیں گے۔ کبر و غرور، فخر و تعلی اور ریا و نمود کا شائبہ



بھی ان میں نہ تھا، اپنے حیرت انگیز اور عظیم الشان کارناموں کی تحسین کے کبھی متوقع نہیں ہوئے، بلکہ ان کو اس کے تذکرے سے بھی وحشت اور گھبراہٹ ہوتی تھی اور جب کوئی داد و تحسین دیتا تو بڑی عاجزی او رناگواری سے اسے سن لیتے۔ حکیم صاحب کی زبان پر کبھی نازیبا اور تہذیب سے گرا ہوا لفظ نہیں آیا، انہیں کسی کو برا کہتے ہوئے نہیں سنا گیا، جو لوگ دق کرتے اور پریشانی کا موجب بنتے ان پر بھی غصہ نہ ہوتے، ضبط، تحمل اور برداشت میں بے مثال تھے، کبھی کسی کی سرزنش نہ کرتے۔ ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیتے اور انتقام کا خیال بھی دل میں نہ لاتے، کہتے تھے کہ انتقام لینے سے پہلے اس پر غور کر لینا چاہئے کہ شاید یہ ہمارے امکان میں نہ ہو یا ہم اس کی طاقت نہ رکھتے ہوں، لیکن عفو و درگزر بہر حال ہمارے بس کی بات ہے اور ہم اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں، ہم عفو و درگزر کر کے شاید قتل کے بغیر دشمن کو مغلوب کر سکتے ہیں۔

سستی اور کاہلی ان کے قریب بھی نہ پھٹکتی، نہایت تیزی سے کام کرتے، ان کی تیز رفتاری کا کوئی ساتھ نہیں دے سکتا تھا، تاہم مردم سازی ان کی خصوصیت تھی اس لئے اپنے مقصد کے افراد تیار کر لیتے، وہ لوگوں کی اصلاح و تربیت زبان کے بجائے عمل سے کرتے، دوسروں سے کام لینے اور کام کرانے کا فن بھی جانتے تھے، حکیم صاحب کی دور بینی لوگوں کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیتی۔ لیکن ان کی لینت و مروت کی وجہ سے بہت سے بے صلاحیت لوگ بھی ان سے چپکے رہتے جن کو وہ اپنی حکمت عملی سے کسی نہ کسی درجہ میں کار آمد بنا لیتے، اس طرح کے بعض لوگ نقصان پہنچانے کے درپے رہتے مگر حکیم صاحب کے دریائے کرم کا بہاؤ ان کی جانب بھی رہتا اور وہ برخواست نہ کئے جاتے، وہ تقلیلِ کلام، تقلیلِ طعام اور تقلیلِ منام پر ہمیشہ عمل پیرا رہے۔ نہایت کم سخن تھے، بس ہاں ہوں میں جواب دیتے، ایک مرتبہ ان کو اور بشیر حسین زیدی صاحب کو اعظم گڈھ سے بابت پور کے لئے نکلنے میں دیر ہو گئی، اندیشہ تھا کہ جہاز چھوٹ جائے گا، میں ساتھ میں تھا، زیدی صاحب راستہ بھر پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر کرتے رہے مگر حکیم صاحب بالکل خاموش تھے، ان پر کسی طرح کی گھبراہٹ نہ تھی جب پہنچے تو جہاز آنے میں کچھ تاخیر تھی، زیدی صاحب نے فرمایا کہ حکیم صاحب میں آپ کی کرامت کا قائل ہو گیا۔

غذا بہت کم تھی، صبح ناشتہ اور رات کو ہلکا کھانا کھاتے، روغنی غذاؤں سے پرہیز کرتے، چائے، پان اور سگریٹ کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ دوسروں کو پر تکلف کھانا کھلاتے، مجھے ان کی بعض دعوتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے، وہ مہمانوں کی خاطر سے بیٹھے رہتے مگر خود کچھ نہ کھاتے، کم خفتن پر بھی عمل تھا، رات میں جلد سو جاتے اور فجر سے بہت پہلے بیدار ہو جاتے، دن میں آرام نہ کرتے۔ وقت اور معمولات کے پابند تھے، ان کا ایک لمحہ بھی رائگاں نہ جاتا، تفریح اور مجلس آرائی سے ہمیشہ دور رہے، ایک

صاحب کو اپنے دفتر میں چھ بجے کا وقت دیا، وہ پہلے ہی آگئے اور حکیم صاحب کو نہ پاکر سخت برہم ہوئے، جب چھ بجا تو حکیم صاحب آگئے، معمولات کی پابندی کا یہ حال تھا کہ صبح میلوں پیدل ٹہلنے کے عادی تھے، آندھی ہو، مینہ برسے، طوفان آئے صبح کے ٹہلنے میں ناغہ نہ کرتے۔

بے حد مشغول رہنے کے باوجود حکیم صاحب لوگوں سے تعلق بھی رکھتے تھے، ہر چھوٹے بڑے سے انتہائی خلوص، خوش اخلاقی اور تواضع سے پیش آتے، ان کی شادی، غمی اور رنج و راحت میں شریک رہتے، میں ایک دفعہ آصف علی روڈ کے مطب میں ان سے ملنے گیا، مریضوں کا تانتا لگا تھا وہاں سے نکلنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک جنازے میں شریک ہوگیا، عین وقت پر حکیم صاحب بھی تشریف لائے اور مجھے دیکھ کر فرمایا ابھی یہیں ہیں۔ احباب سے ملاقات کے لئے جاتے۔ مہمانوں اور عزیز و اقارب کی خاطر داری کرتے اور دوسرے ضروری کاموں کے لئے بھی وقت نکال لیتے، دلی کی ادبی و ثقافتی تقریبات میں بھی شریک ہوتے، اپنے چھوٹے بھائی حکیم محمد سعید سے غیر معمولی محبت تھی، وہ ۴۸ء میں پاکستان جانے لگے تو انہیں بڑا صدمہ تھا، ایسے شیر و شکر اور ایک جان دو قالب بھائی تلاش کرنے پر بھی نہیں ملیں گے، اُن کے بے رحمانہ قتل نے ان کو نڈھال کر دیا تھا اور زیادہ دنوں تک اُن کی جدائی برداشت نہیں کرسکے حالانکہ وہ مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے

ان کی زندگی کا ایک بڑا تابناک کارنامہ ان کی تعمیرات ہیں، وہ اس عہد کے شاہ جہاں تھے، انہوں نے تغلق آباد کے خرابے کی نوے ایکڑ زمین پر خوبصورت اور سربفلک عمارتوں کا ایک شہر ہمدرد نگر کے نام سے بسا دیا ہے، عمارتوں کے نقشوں کو آخری منظوری وہ خود دیتے تھے۔ تغلق آباد کی پرشکوہ عمارتیں، آصف علی روڈ پر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن اور تعلیم آباد میں ہمدرد پبلک اسکول کی عمارتیں ان کے اعلیٰ ذوق کا نمونہ ہیں جو دلی کا حسن دوبالا کرتی ہیں۔ غرض حکیم صاحب ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں شخص تھے، وہ بیسویں صدی کے عظیم ترین اور نابغہ روزگار انسان تھے جو قدرت کی بے اندازہ فیاضیوں کا مظہر بن کر عالم وجود میں آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہشت بریں عطا کرے آمین!

جان کر من جملہ خاصان میخانہ مجھے　　مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے



مقالات

# تجرباتی علوم کی حقیقت و اہمیت

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی ٭

## سائنسی علوم اور دینی طبقہ

مذہبی حلقوں میں سائنسی علوم کے بارے میں عمومی طور پر بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جن میں سے ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ سائنسی علوم کو تغیر پذیر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر میں ان سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان کی نظر میں ایسا کرنے سے آیندہ جب نظریات بدل جائیں گے تو اس سے قرآن پر حرف آسکتا ہے اور وہ یہ بات کسی تحقیقی مطالعے کی بنا پر نہیں بلکہ ایک چلتے چلائے فقرے کے طور پر کہتے ہیں جو دینی حلقوں میں ایک "فیشن" سا بن گیا ہے۔ چنانچہ سائنسی علوم اور ان سے استدلال کے سلسلے میں جب بھی کوئی بحث سامنے آتی ہے تو دین دار طبقہ انتہائی سادگی کے ساتھ بطور نصیحت کہتا ہے کہ ان علوم سے استدلال مت کیجیے کیونکہ یہ علوم تغیر پذیر ہیں۔ اس طرح کوئی بھی سائنسی تحقیق خواہ وہ کتنی ہی معتبر اور تجرباتی نقطۂ نظر سے کتنی ہی مدلل و مستحکم کیوں نہ ہو اسے رد کرنے کے لئے صرف اس قدر کہنا کافی ہوجائے گا کہ "سائنسی علوم تغیر پذیر ہیں، لہٰذا ان سے استدلال مت کرو"۔ اس طرح ہمارا دین دار طبقہ تمام تجرباتی علوم و مشاہداتی حقایق کو محض ایک "جملے" کے ذریعہ القط کر دیتا ہے۔ اور یہ بات کیا عالم اور کیا عامی ہر ایک آنکھیں بند کرکے برابر دہرائے چلا جا رہا ہے اور اسے اس بات کا کوئی شعور نہیں ہے کہ ان علوم کی حقیقت کیا ہے اور ان کا نفوذ اور ان کی کار فرمائیاں

٭ ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ و چیرمین دار الشریعۃ، بنگلور ۲۹۔

کیا ہیں؛ غرض ایسے لوگوں نے نہ تو ان علوم کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ کیا ہے اور نہ ہی انہوں نے قرآنِ حکیم کو غور سے پڑھا ہے۔ لہذا اس قسم کی بات کہنا قرآنِ حکیم کی قطعیت کے بارے میں شکوک پیدا کرنا ہے۔ کیونکہ قرآن کے منصوص بیانات اس قسم کی خام خیالی کا رد کرتے ہوئے مشاہداتی و تجرباتی علوم کو قابل حجت قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ بے شمار قرآنی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔

### سائنسی علوم سے چھوت چھات کا نتیجہ

حقیقت یہ ہے کہ سائنسی علوم نے آج ہر چیز کا احاطہ کر کے پوری دنیا کو مسخر کر لیا ہے اور مادی اشیاء کے ظاہری و باطنی فوائد سے متمتع ہو کر اتنا غلبہ حاصل کر لیا ہے کہ وہ اب کرۂ ارض سے باہر نکل کر اجرام سماوی اور کائنات کی تسخیر کی راہ پر چل پڑے ہیں، مگر ہم ابھی تک اس بحث ہی میں پڑے ہوئے ہیں کہ یہ علوم آیا معتبر ہیں بھی یا نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ہم میں سے ۹۹ فیصد لوگ محض ایک خیالی دنیا میں رہتے ہوئے ان اہم اور مفید علوم کو "نامعتبر" تصور کرتے ہیں اور بعض حلقے تو عوام کو یہاں تک "مشورہ" دیتے ہیں کہ وہ ان "علوم باطل" سے دور ہی دور رہیں، ورنہ وہ گمراہ ہو جائیں گے۔ اس طرح ان علوم سے کنارہ کشی اختیار کر کے ہم دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے زبردست خسارے میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے، جس کے باعث ملت اسلامیہ خلافت ارضی کے میدان میں دیگر اقوام سے کوسوں دور ہو گئی ہے اور اس غلط فہمی تاریخی بھول کی ملت اسلامیہ کو بہت بڑی قیمت چکانی پڑی ہے۔

لہذا ضروری ہے کہ ہم پوری سنجیدگی کے ساتھ جدید علوم و مسائل کا شرعی و عقلی دونوں نقطہ ہائے نظر سے جائزہ لے کر اس سلسلے کی غلط فہمیوں کو دور کریں۔ چنانچہ اس مضمون میں پہلے علمی و عقلی نقطہ نظر سے تجرباتی علوم کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالی جائے گی اور پھر شرعی نقطہ نظر



سے ان پر کلام کیا جائے گا۔

### تجرباتی علوم کی کارفرمائی

اس موقع پر تجرباتی علوم کی کارفرمائی کے سلسلے میں ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ جب کوئی شخص رواں بجلی کے تار کو چھوتا ہے تو اسے برقی رو (کرنٹ) کا ایک جھٹکا لگتا ہے اور بطور نتیجہ اس کا سارا جسم لرز اٹھتا ہے۔ اگر یہ جھٹکا طاقت ور ہو تو اس شخص کی فوری طور پر موت واقع ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ بجلی کیا ہے اور اس میں یہ طاقتور لہریں کس طرح پیدا ہو گئیں؟ تو یہ چیز اس سائنسی نظریہ اور تجربے پر مبنی ہے کہ دنیا کی ہر چیز الکٹرانوں اور پروٹانوں کا مجموعہ ہے۔ الکٹرانوں میں منفی برقی چارج اور پروٹانوں میں مثبت برقی چارج ہوتا ہے اور یہ برقی چارج دو اشیاء کو باہم رگڑ کر ایک کو دوسرے میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ کچھ مادوں اور خاص کر دھاتوں میں الکٹران کافی مقدار میں "آزاد" ہوتے ہیں جو ایک دھارے میں حرکت کر سکتے ہیں اور یہی دھارا "برقی رو" یا بجلی کہلاتا ہے، جو تاروں پر حرکت کرتے یا دوڑتے ہوئے بڑے بڑے کام انجام دیتا ہے اور اس کی مضرت سے بچنے کے لئے ان تاروں پر پلاسٹک کا خول چڑھا دیا جاتا ہے جو غیر موصل ہوتا ہے[1]۔

چنانچہ اس بجلی سے حرارت، روشنی اور میکانیکی توانائی حاصل کی جاتی ہے اور اس سے بڑی بڑی مشینیں چلائی جاتی ہیں۔ تمدن جدید کا سارا دارومدار بجلی (الکٹرسٹی) ہی پر منحصر ہے، اگر بجلی نہ ہو تو پھر تمدن جدید کی ساری رونق یک لخت ختم ہو جائے گی اور یہ بجلی جنریٹروں اور آبشاروں وغیرہ سے پیدا کی جاتی ہے اور یہ بات تجرباتی ہونے کے لحاظ سے آج بھی صحیح ہے اور ہمیشہ صحیح رہے گی۔

### قوانین فطرت ناقابل تغیر

اسی طرح جب کسی مادی چیز کو گرم کیا جائے تو اس سے بھاپ نکلتی ہے، جسے مقید کر کے مشینیں چلائی جاتی ہیں۔ پٹرول کو جلا کر موٹر، کار، ریل اور ہوائی جہاز

وغیرہ چلائے جاتے ہیں۔ بعض عناصر جیسے یورانیم کے "مراکزہ" کو توڑ کر بجلی پیدا کی جاتی ہے اور اٹیم بم بنایا جاتا ہے۔ لاسلکی (بغیر تار) کے ذریعہ پیغامات ایک براعظم سے دوسرے تک پہنچائے جاسکتے ہیں۔ جیسے ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر، فیکس اور کمپیوٹر انٹرنیٹ وغیرہ۔ بین البراعظمی میزائیلوں کے ذریعہ کسی بھی ملک کو نشانہ بناکر اسے تباہ و برباد کیا جاسکتا ہے۔ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بموں کے ذریعہ پورے پورے شہروں کو کھنڈروں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ نیپام بموں کے ذریعہ کسی بھی مقام کو شعلوں اور آگ کے گولوں میں بدلا جاسکتا ہے اور جراثیمی بموں کے ذریعہ شہری آبادیوں کو مفلوج کیا جاسکتا ہے۔

یہ سب تجرباتی علوم کی کارستانیاں ہیں جن سے نتائج ہمیشہ یکساں نکلتے ہیں۔ کیونکہ ان علوم کی کارفرمائیاں قوانین فطرت (لاز آف نیچر) کے تابع ہیں، لہذا ان میں تبدیلی محال ہے۔ جب بھی آپ کسی شخص کو بندوق کی گولی کا نشانہ بنائیں گے یا تلوار سے اس کی گردن کاٹ دیں گے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

**بعض فلکیاتی پیش گوئیاں**

آپ فلکیات کی دنیا میں آیئے تو آپ کو دو قسم کے نظریات ملیں گے بعض تخمینی اور بعض حسابی و مشاہداتی۔ تخمینی نظریات سے یقین کی کیفیت حاصل نہیں ہوتی بلکہ ان سے ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ جیسے کیا ہماری کائنات ایک دھماکے کے ساتھ وجود میں آئی یا اس کا مادہ ہمیشہ سے اور مسلسل بنتا جارہا ہے؛ زمین اور ستاروں کی عمر کیا ہے؟ ہماری زمین پر زندگی کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس قسم کے نظریات محض "مفروضات" کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ یہ نظریات تجرباتی حقائق پر مبنی نہیں ہیں۔ اس کے برعکس بعض حسابی اور مشاہداتی نظریات ایسے ہیں جو بالکل یقینی ہیں جیسے کسوف (سورج گرہن) کے بارے میں یہ نظریہ کہ یہ ظہور قدرت زمین اور سورج کے درمیان چاند کے حائل ہوجانے کی وجہ سے



ہوتا ہے اور خسوف (چاند گرہن) کے بارے میں یہ نظریہ کہ چاند اور سورج کے درمیان زمین کے حائل ہوجانے کی وجہ سے واقع ہوتا ہے۔ اسی طرح کسوف و خسوف کے بارے میں بالکل صحیح پیش گوئیاں کی جاتی ہیں کہ وہ فلاں سال، فلاں دن اور فلاں وقت واقع ہوں گے۔

نیز اسی طرح بعض سیارچوں اور دم دار ستاروں کے ہمارے نظام شمسی میں داخل ہونے اور ان کے کسی سیارے سے ٹکرانے کے بارے میں بھی برسوں پہلے صحیح صحیح پیش گوئیاں کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر "ہیلی" نامی دم دار ستارہ ہر ۷۶ سال میں ایک بار ہمارے نظام شمسی میں داخل ہوتا ہے اور اب تک اس کے ۳۰ مرتبہ ظہور کے ریکارڈ موجود ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ ۲۴۰ ق م میں دیکھا گیا تھا اور آخری مرتبہ ۱۹۸۶ء میں نظر آیا [ـه]

سورج گرہن جزئی یا مکمل طور پر ہر سال دو سے پانچ مرتبہ ہوتا ہے (پانچ مرتبہ استثنائی طور پر) چنانچہ یہ منظر قدرت ۱۹۳۵ء میں پانچ مرتبہ ظہور میں آیا تھا۔ اب یہ دوبارہ ۲۰۰۶ء میں پھر پانچ مرتبہ ظہور میں آئے گا۔ ایک صدی میں مکمل سورج گرہن ۶۶ مرتبہ واقع ہوتا ہے۔ [ـه]

**لیزر شعاعوں کی حیرت انگیزی**

عصر جدید میں لیزر شعاعیں سائنس کی ایک عظیم دریافت ہے، جس کا انکشاف ۱۹۶۰ء میں ایک امریکی ماہر طبیعیات کے ذریعہ ہوا۔ پہلے پہل اس کا استعمال چند امور میں ہوا اور سائنس دانوں نے اسے اپنے بعض مسائل کا حل سمجھا، مگر آج اس انکشاف کا شمار عصر جدید کے ان اہم اور ہمہ گیر آلات میں ہوتا ہے جنھوں نے انسانی زندگی کا احاطہ کرلیا ہے۔

لیزر شعاعوں کے ذریعہ آج محیر العقول کام لئے جارہے ہیں۔ چنانچہ اس کی شعاع سے ہیرے جیسی دنیا کی سخت ترین چیز کو چھیدا جاسکتا ہے اور اس کی نفاست و حسن کاری گری کا یہ عالم ہے کہ ایک پن کے سرے جیسی ایک چھوٹی سی جگہ میں لیزر شعاع کے ذریعہ دو سو چھید

بنائے جا سکتے ہیں، دھات کی اشیاء کو اس کے ذریعہ کاٹا اور جوڑا جا سکتا ہے، اشاراتی زبان کو پڑھا جا سکتا ہے، پیغامات ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جا سکتے ہیں، ایک میزائل کو صحیح نشانے تک پہنچایا جا سکتا ہے، آنکھوں کی مرمت کی جا سکتی ہے، دستاویزات چھاپی جا سکتی ہیں۔ مثلاً زیرکس مشینوں اور لیزر پرنٹروں میں یہ ٹکنالوجی استعمال کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے ذریعہ کسی جرم عظم کی حرکت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے [4]

**لیزر کی ہمہ گیری** لیزر ایک ایسی حیرت انگیز چیز ہے جس کے ذریعہ بے شمار کام لئے جا رہے ہیں۔ جیسے معلومات کو ریکارڈ کرنا اور انہیں محفوظ رکھنا، جیسا کہ کمپیوٹر ٹکنالوجی میں کیا جا رہا ہے، چنانچہ ایک چھوٹی سی فلاپی یا سی ڈی میں لاکھوں صفحات کا مواد بھر دیا جاتا ہے۔ ایک بڑی سے بڑی انسائیکلو پیڈیا ایک ہتھیلی کے برابر چوڑی جگہ میں سمو دی جاتی ہے اور کئی فلاپیوں کی موٹائی ایک انچ کے برابر ہوتی ہے جنھیں آسانی کے ساتھ جیب میں رکھا جا سکتا ہے۔

لیزر کے ذریعہ اپنے پیغامات دنیا کے کسی بھی حصے میں آن کی آن میں (ای میل کے ذریعہ) بھیجے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح اس کے ذریعہ اسکیننگ ( SCANNING ) کی جا سکتی ہے۔ یعنی لیزر شعاعوں کے ذریعہ جسم کے اندرونی حصوں کی تصاویر لی جا سکتی ہیں اور اندرونی اعضاء کی خرابی کا معائنہ کیا جا سکتا ہے۔

لیزر کے ذریعہ فلموں کو پلیٹوں میں ریکارڈ کیا جا سکتا ہے، سوپر مارکیٹوں میں سامان چیک کر کے ساری معلومات کمپیوٹر کو فراہم کی جا سکتی ہیں۔ لیزر کا سب سے عظیم تر استعمال عالمی مواصلات میں ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس ٹکنالوجی کی بدولت ٹیلی فون کی کالوں اور ٹیلی ویژن کی تصاویر کے برقی اشاروں کو لیزر شعاعوں کی لہروں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو فی الحقیقت ایک ستاعل ہے اور اس کو بصریاتی ریشہ (کانچ کا تار) جو ایک انسانی بال سے زیادہ موٹا نہیں ہوتا، وہ تانبے کے



بنے ہوئے ہزاروں ٹیلی فون کے تاروں کے مقابلے میں زیادہ پیغامات پہنچا سکتا ہے۔

نیز اسی طرح لیزر شعاعوں کے ذریعہ (دور دراز کا) فاصلہ ناپا جا سکتا ہے۔ لیزر شعاعوں کے ذریعہ ماہرین ارضیات زمین کی اندرونی حرکات کا پتہ لگا کر زلزلوں کی پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ لیزر ٹکنالوجی کے ذریعہ بنے ہوئے بعض آلات کے ذریعہ صحیح سمت سے انحراف کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ آلات پانی کے جہازوں، ہوائی جہازوں اور گائیڈڈ میزائلوں وغیرہ کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔[5]

غرض لیزر کا استعمال آج اس قدر عام اور ہمہ گیر ہو گیا ہے کہ گھروں، دفتروں، کارخانوں، ہسپتالوں، لائبریریوں اور فوجی میدانوں میں ہر جگہ اس کا نفوذ دکھائی دیتا ہے اور وہ تمدن جدید کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تجرباتی سائنس کے کرشمے ہیں جو دو اور دو چار کی طرح واضح ہیں یعنی ان کے اصول و ضوابط میں کوئی بدنظمی یا انتشار دکھائی نہیں دیتا۔

**بجلی کی کارفرمائیاں** طبیعیات (فزکس) کی دنیا میں آج جو عظیم الشان انقلاب آیا ہے وہ مواصلاتی نظام میں بجلی کی کارفرمائیاں ہیں جو حد درجہ حیران کن ہیں۔ چنانچہ آج ٹیلی فون، ریڈیو، ٹی وی، فیکس اور کمپیوٹر وغیرہ سب کے سب برقی قوت ہی سے چلتے ہیں اور مواصلاتی سٹیلائٹوں کی مدد سے آن کی آن میں ان کے پیغامات دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا تمام مواصلاتی ذرائع میں برقی قوت کو برقی لہروں میں تبدیل کر کے ان کے ذریعہ کسی بھی پیغام یا چھپے ہوئے اوراق کو دنیا کے کسی بھی مقام تک ایک سکنڈ سے بھی کم وقت میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ بجلی کی لہریں روشنی کی رفتار (فی سکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل) سے چلتی ہے اور یہ لہریں ایک سکنڈ میں کرۂ ارض کے سات چکر لگا لیتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم اپنی آواز اور اپنا کوئی بھی چھپا ہوا پیغام ٹیلی فون، فیکس اور ای میل کے ذریعہ ایک سکنڈ سے بھی کم حصے میں دنیا کے کسی بھی مقام تک پہنچا سکتے یا منگوا سکتے ہیں اور ٹی وی کے سامنے

بیٹھ کر دنیا بھر میں ہونے والے واقعات اور کھیل کود کے مقابلے مواصلتی سیارچوں کی مدد سے لمحہ بہ لمحہ اس طرح دیکھ سکتے ہیں گویا کہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہوں۔

یہ سب طبیعیات (فزکس) کے کرشمے ہیں جو نہایت درجہ منظم اصولوں کے تحت جاری و ساری ہیں اور ان میں بخت و اتفاق کا گزر نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اصول قیامت تک اسی طرح جاری رہیں گے اور ان میں تبدیلی محال ہے۔

## کمپیوٹر سائنس میں انقلاب

عصر جدید کی سب سے زیادہ حیران کن ایجاد کمپیوٹر ہے جس کے ذریعہ جدید مواصلاتی نظام میں زبردست انقلاب آگیا ہے اور یہ بالکل الف لیلوی داستانوں یا جادو کی نگری کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ آج کا کمپیوٹر لاکھوں کروڑوں صفحات کا "حافظہ" یا میموری اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے اور اس کے اندر محفوظ "معلومات" میں سے کوئی بھی چیز جب چاہے چند مخصوص بٹنوں کو دبا کر اسکرین پر لائی جاسکتی ہے اور اسے نہ صرف پڑھا جاسکتا ہے بلکہ کمپیوٹر سے منسلک پرنٹر کی مدد سے کاغذ پر چھاپا بھی جاسکتا ہے اسی طرح کمپیوٹر کی مدد سے ڈی۔ٹی۔پی کا کام بھی لیا جاسکتا ہے یعنی بعض "سافٹ ویروں" کی مدد سے کسی بھی زبان کا مواد کمپوز کرکے اخبار یا رسالہ یا کتاب طباعت کے لئے تیار کی جاسکتی ہے اور اس کام کے لئے اب کاتبوں کی ضرورت باقی نہیں رہی بعض سافٹ ویروں (مثلاً کورل ڈرا) کی مدد سے کوئی بھی تصویر یا نقشہ یا ڈرائنگ اخبار یا کتاب کے درمیان جہاں چاہے سیٹ کئے جاسکتے ہیں۔ بڑے بڑے انسائیکلو پیڈیا اب خریدنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان کی "سی ڈی" (جو بالکل ایک چھوٹی سی پلیٹ کی طرح ہوتی ہے) حاصل کرکے اسے اپنے کمپیوٹر پر نہ صرف دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے بلکہ "ساؤنڈ کارڈ" کی مدد سے اس کی عبارت کو آواز کے ساتھ سنا بھی جاسکتا ہے جو کمپیوٹر کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اس طرح کی دس سی ڈیز ہم اپنی جیب میں رکھ سکتے ہیں جن میں تقریباً بیس لاکھ صفحات کا مواد ہوتا ہے۔ گویا کہ ہم بیس لاکھ صفحات کی کتابیں



اپنی ایک جیب میں رکھ سکتے ہیں۔

کمپیوٹر کے ان تمام فوائد اور کمالات کے علاوہ اس کا سب سے بڑا انقلاب انگیز پہلو یہ ہے کہ "انٹرنیٹ سروس" کے ذریعہ اب دنیا کے تمام کمپیوٹر (جو اس سروس کے باقاعدہ ممبر ہیں) وہ آپس میں جڑ گئے ہیں۔ چنانچہ اب اس سروس کے ذریعہ دنیا بھر کی لائبریریوں، دنیا بھر کے اخبارات اور دنیا بھر کی معلومات سے جب چاہے اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنے کمپیوٹر کی مدد سے استفادہ کرنا ممکن ہوگیا ہے اور اس مقصد کے لئے اب یورپ اور امریکہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اب کوئی اخبار خریدنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کا جو بھی اخبار (جو انٹرنیٹ سے جڑا ہوا ہو) محض اس کا نام ٹائپ کر دینے سے وہ ہمارے کمپیوٹر پر نمودار ہو جائے گا اور ہم اسے نہ صرف پڑھ سکتے ہیں بلکہ اس کے کسی بھی مضمون کو اپنے ریکارڈ کے لئے اپنے پرنٹر کی مدد سے منٹوں میں کاپی بھی لے سکتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی کمپیوٹر انٹرنیٹ سروس کے ذریعہ آپس میں جڑے ہوئے ہیں (اور ان کی تعداد لاکھوں میں ہے) ان تمام کو اپنا کوئی بھی پیغام (چھپے ہوئے مواد کی شکل میں) محض ایک بٹن دبا کر بیک وقت پہنچا سکتے ہیں۔ اس طرح ایک سکنڈ سے بھی کم وقفہ میں ہمارا پیغام دنیا بھر کے تمام کمپیوٹروں کو بیک وقت پہنچ جائے گا اور اس سروس کا نام "ای میل" ہے۔ اسی طرح کوئی "نیوز ایجنسی" قائم کرنے کے لئے اب زیادہ جھنجھٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ "ویب سائٹ" قائم کرکے اپنے ملک یا اپنے علاقے کے واقعات، معلومات اور تجربے وغیرہ دنیا بھر کے کمپیوٹروں کو جو آپس میں جڑے ہوئے ہیں (اور ان میں اخبارات کے دفاتر میں لگے ہوئے کمپیوٹر بھی ہیں) سب کو آن کی آن میں اپنی معلومات فراہم کرسکتے ہیں۔ مستقبل میں کمپیوٹر سائنس میں اور بھی زبردست انقلابات آنے والے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب تجرباتی سائنس کے کمالات ہیں جو "برقی قوت" کی تسخیر کی بدولت ظاہر ہورہے ہیں۔ اس لحاظ سے برقی قوت اور اس سے استفادہ نظریاتی اور تجرباتی دونوں حیثیتوں سے صحیح ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب "بدلتے ہوئے نظریات" کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ ان قوانین وضوابط سے ہم مسلسل اور لگاتار مستفید ہورہے ہیں۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قوانین وضوابط اور ان کی کارفرمائیاں آج تو صحیح ہیں مگر کل وہ بدل جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی بات کرنا ان علوم اور ان کے مسائل سے ناواقفیت کی دلیل ہے

## جوہری توانائی کے کرشمے

جوہری توانائی بیسویں صدی کی سب سے اہم دریافت ہے جس نے عصر جدید میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ اسی وجہ سے آج ایٹم کے مرکزے (نیکلیس) کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور یہ جوہری توانائی تعمیری اور تخریبی دونوں پہلوؤں کی حامل ہے۔ چنانچہ اس کا مفید اور تعمیری پہلو یہ ہے کہ آج انسان اس قوت کے ذریعہ گھروں اور کارخانوں کو روشن کررہا ہے، بڑی بڑی مشینیں چلارہا ہے، بحری جہازوں اور آبدوزوں کو حرکت میں لارہا ہے، نیز وہ طب، کاشت کاری اور صنعت وحرفت کے میدانوں میں اس پوشیدہ قوت کے ذریعہ حیرت انگیز فوائد حاصل کررہا ہے۔ چنانچہ تابکار آئی سوٹوپ (ریڈیو آئی سوٹوپ) کی مدد سے آج زراعت کے وسائل کو بہتر سے بہتر بنایا جارہا ہے۔ پودوں میں کھاد کی نقل وحرکت کا پتہ لگایا جارہا ہے، پودوں کی زندگی پر اثرانداز ہونے والے محرکات کا پتہ لگایا جارہا ہے نیز اس کے ذریعہ پودوں میں بیماریاں پھیلانے والے حشرات کا مطالعہ کیا جارہا ہے

اسی طرح آئی سوٹوپ کی آج طبی نقطہ نظر سے اتنی اہمیت ہوگئی ہے کہ اب یہ ہسپتالوں میں "ڈاکٹری سامان" کا ایک ضروری جز سمجھا جاتا ہے اور اس کی بدولت ڈاکٹر مختلف بیماریوں کا پتہ چلاتے ہیں، اس کے ذریعہ کینسر کا پتہ چلایا جاتا ہے اور دوران خون کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور



جوہری توانائی کا تخریبی پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم وغیرہ تیار کرکے پورے پورے شہروں کو آن کی آن میں کھنڈروں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کو تباہ کرکے رکھ دیا تھا۔

غرض سائنس اور ٹکنالوجی نے آج ہمہ گیر ترقی کرلی ہے اور وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہوچکی ہے اور پوری دنیا کو اپنے گھیرے میں لے چکی ہے۔ اب ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی کارفرمائیوں سے ہٹ کر ہمارے لئے زندگی گزارنا محال بن گیا ہے اور یہ سارے کارنامے طبیعیات اور کیمیا کی بے مثال ترقی کی بدولت ہیں۔

غرض ان تجرباتی علوم اور ان کی کارفرمائیوں کے نتائج ہمیشہ یکساں نکلتے ہیں اور ان میں کبھی تغیر یا انتشار نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ جب کبھی بجلی کا سوئچ آن کریں بلب روشن ہوجاتا ہے اور مشینیں چل پڑتی ہیں۔ بندوق کی لبلبی کھینچتے ہی فائر ہوجاتا ہے اور نشان زدہ چیز کے چیتھڑے اُڑ جاتے ہیں۔ زمین پر بیٹھے بیٹھے نہ صرف خلائی جہازوں کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کی مرمت بھی کی جاسکتی ہے۔ لاسلکی کے ذریعہ خلاؤں میں اپنا پیغام بھیجا جاسکتا ہے اور چاند اور مریخ کے ذریعہ رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ زمین پر بیٹھے بیٹھے چاند اور مریخ کی سطح کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح آپ کا سوٹ کیس کھولے بغیر ایکس رے شعاعوں کی مدد سے اندر کا سامان چیک کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ایک ملک سے دوسرے ملک کو جانے والوں کو کسٹم چیک سے گزرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام انسانی فتوحات چند مادی قوانین کے تابع ہیں جن کو برتنے پر یہ تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں اور یہ فطرت کے وہ قوانین ہیں جو ہزاروں سال پہلے بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں مگر ان قوانین سے پچھلے دور کا انسان واقف نہیں تھا اس لئے وہ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔

## سائنسی علوم کا علمی پہلو

یہ سائنسی علوم کا محض ایک پہلو ہے جو مادی اور تمدنی نقطۂ نظر سے ہے اور ان علوم کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو علمی و استدلالی ہے۔ چنانچہ ان علوم میں غور وفکر اور تحقیق وجستجو کے باعث مظاہر فطرت اور ان کے نظاموں میں پنہاں اصول وضوابط بھی سامنے آتے ہیں جو علمی اعتبار سے نہایت درجہ اہم ہیں۔ کیونکہ ان اصول وضوابط کو منطقی اعتبار سے "دلائل ربوبیت" کے روپ میں مرتب کرکے الحاد ولادینیت کا رد وابطال کیا جاسکتا ہے اور خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت ثابت کی جاسکتی ہے۔ اثبات خداوندی پر نظام کائنات سے استدلال انتہائی موثر طور پر ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ سائنسی تحقیقات وتجربات کی رو سے مانے ہوئے اور مسلم اصولوں کے تحت ہوتا ہے یعنی وہ اصول جو "قوانین فطرت" کا درجہ حاصل کرچکے ہوں۔ لہذا منکرین ان اصول وضوابط کا انکار نہیں کرسکتے۔ کیونکہ وہ خود انہیں کی تحقیقات وتجربات کے نتائج ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے نظام فطرت کے اصولوں سے استدلال نہایت درجہ مسکت ومدلل ہوتا ہے۔ منطقی اعتبار سے جب خدا کا وجود ثابت ہوجائے تو پھر لامحالہ طور پر خدائی احکام کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا اور اس کے پورے ضابطۂ حیات کو ماننا پڑے گا۔ اس طرح علمی وعقلی نقطۂ نظر سے خدا پرستی کی جانب اولین زینہ ایمانیات کا اثبات ہے جس کے بعد عملیات اور اخلاقیات کی منزل خود بخود آجاتی ہے۔ یعنی ایک بار انسان جب خدا کا وجود تسلیم کرلے تو پھر اسے خدائی ضابطۂ حیات کو بے چون وچرا تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

## عصر جدید کی عقلیت اور اسلام کی رہنمائی

موجودہ دور میں "علم" اور "عقل" یا سائنس اور فلسفے کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور آج کا انسان کسی بھی بات کو بے چون وچرا تسلیم کرلینے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ ہر چیز کو علمی وعقلی نقطۂ نظر سے جانچنے کا عادی بن چکا ہے۔ چنانچہ وہ سوال کرتا ہے کہ خدا کا وجود کیوں اور کس لئے؟ اور اس کے وجود کی دلیل کیا ہے؟ بعض سائنس زدہ لوگ تو خدا کے وجود کو پرانے دور کی داستان قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کو خود سائنسی



حقائق کی روشنی میں بتاتا ہے کہ وجود خداوندی کے سائنٹفک دلائل (آیات الٰہی) کیا ہیں؟ اور مظاہر کائنات کے نظاموں سے کیا ثابت ہوتا ہے۔

اسلام چونکہ قیامت تک ہر دور کے لئے کامل ضابطۂ حیات ہے جس میں ہر دور کی ذہنیت کے مطابق علمی وعقلی دلائل اور نوع انسانی کی ذہنی تشفی کا سامان رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کے صحیفے میں عصر حاضر کی ذہنیت کے توڑ کا سامان بھی ابدی منصوبے کے مطابق موجود ہے، جو ایک معجزانہ کلام ہے اور وہ قیامت تک پیش آنے والے فکری مسائل میں نوع انسانی کی ہدایت کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ موجودہ مادہ پرستانہ ذہنیت کو بدلنے کے لئے نوع انسانی کو دعوتِ فکر دیتا ہے کہ وہ مظاہرِ کائنات اور ان کے نظاموں میں غور وخوض کرکے یہ پتہ لگائیں کہ ان سے کیا منطقی دلائل مترشح ہوتے ہیں اور کون سے اسباق وبصائر سامنے آتے ہیں؟ مثال کے طور پر ارشاد باری ہے:

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس: ۱۰۱)

کہدو کہ (غور سے) دیکھو کہ زمین اور آسمانوں میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں؟

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (جاثیہ: ۳-۴)

ایمان لانے والوں کے لئے زمین اور آسمانوں میں بہت سی نشانیاں (دلائل ربوبیت) موجود ہیں اور خود تمہاری خلقت اور زمین میں پھیلائے گئے جانداروں میں بھی یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں۔

وجود باری اور اس کی وحدانیت کی یہ نشانیاں طبیعی اور حیاتیاتی اعتبار سے دنیا کا ہر شے

اور ہر مظہر قدرت میں پائی جاتی ہیں جن پر گہری نظر ڈالنے یا تحقیقی مطالعہ کرکے ان کے اندر ودیعت شدہ دلائل ربوبیت کو واشگاف کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ان سے بڑھ کر واضح آیات اور کیا ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف مظاہر فطرت پر نظر ڈالنے یا ان میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی جارہی ہے تو دوسری طرف فرمایا جارہا ہے کہ ان مظاہر میں ایمان لانے والوں اور یقین کرنے والوں کے لئے وجود باری کے دلائل موجود ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ قرآن کی نظر میں انسان اپنے مشاہدات وتحقیقات کے ذریعہ ایسے دلائل تک رسائی حاصل کرسکتا ہے جو یقین آور ہوسکتے ہوں۔ بالفاظ دیگر انسانی علم اور اس کی تحقیقات قرآن حکیم کی نظر میں معتبر وحجت ہیں۔

## سائنسی علوم اور تجرباتی حقایق

غرض انسانی مشاہدات وتجربات دینی وشرعی نقطۂ نظر سے قابل اعتبار ہیں جن کو مہمل قرار دینے کی کوئی شرعی یا عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ سائنسی علوم اور تجرباتی حقایق کو ناقابل اعتبار قرار دینے سے مسلم معاشرہ نہ صرف ذہنی انتشار سے دوچار ہوتا ہے بلکہ دینی و دنیوی دونوں اعتبارات سے وہ دوہرے قسم کا نقصان اٹھاتا ہے۔ چنانچہ دنیوی اعتبار سے نقصان یہ ہے کہ آج مسلم ممالک سائنسی میدان میں پیچھے ہوجانے کی وجہ سے پس ماندہ بن کر فوجی وسیاسی میدان میں ترقی یافتہ قوموں سے شکست پر شکست کھارہے ہیں اور دینی اعتبار سے نقصان یہ ہے کہ علمائے اسلام کے ان علوم سے چھوت چھات برتنے کی وجہ سے موجودہ سائنسی دور میں علمی وعقلی نقطۂ نظر سے قرآن عظیم کی ہدایت ورہنمائی واضح کرکے اس کا علمی اعجاز ثابت کرنے میں وہ ناکام ہوچکے ہیں اور جب تک ان علوم سے بیگانگی باقی رہے گی دینی و دنیوی دونوں میدانوں میں ہماری پس ماندگی کا یہی عالم رہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ خداوند کریم نے ہمیں ہر اعتبار سے مکمل اور حیرت انگیز صحیفہ عطا فرمایا ہے تاکہ ہم ہر دور کی ذہنیت کے مطابق کام کرکے دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہوں، مگر ہم نے اپنی غفلت



اور کوتاہی کی بدولت اسلام کو ایک پس ماندہ مذہب اور مسلمانوں کو ایک پس ماندہ قوم بنا کر رکھ دیا ہے اور عصری تقاضوں سے آنکھیں بند کرکے اپنی قدیم روش ہی پر دوڑے جارہے ہیں۔

سائنسی علوم سے علمار کی دوری یا ان سے چھوت چھات کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سائنسی علوم کو مادیت کے مترادف سمجھتے ہیں یعنی ان کی نظر میں سائنس اور مادیت دونوں ہم معنی یا ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ حالانکہ سائنسی علوم اصلاً رازہائے فطرت کی تحقیق وجستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا وہ مادیت کے مترادف نہیں ہوسکتے۔ ہاں البتہ مظاہر فطرت کی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے تشریح وتوجیہ ضرور قابلِ اعتراض ہوسکتی ہے۔ مگر ہم ان دونوں میں فرق وامتیاز کرسکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان علوم میں پوری طرح مہارت حاصل کرلیں۔ لہٰذا آج ہم کو یہی کام کرنا ہے اور یہ انسانیت کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ لہٰذا ہمارے علمار کو اس میدان میں پیش رفت کرنا چاہئے۔ یہ وقت کی پکار ہے۔

## علم انسانی کے حدود

اوپر سائنسی علوم کی قطعیت وحجیت کے بارے میں جو گفتگو کی گئی ہے وہ ان علوم کی "ظاہریت" کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ ان علوم کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور دوسرے باطنی۔ پہلی حیثیت سے وہ نہایت درجہ واضح ومفصل ہیں اور ان کے اصول باضابطہ ہیں۔ جب کہ دوسری حیثیت سے وہ حد درجہ غامض اور پُراسرار بھی ہیں۔ بالفاظ دیگر انسان موجودات عالم کے بارے میں جو کچھ جانتا اور ان سے جو کچھ مادی فوائد حاصل کرتا ہے وہ ان کے ظاہری تعامل کی بنا پر ہے، جب کہ دوسری طرف ان کی اصل حقیقت وماہیت اور ان کی اندرونی مشنری اور کارکردگی کا حال پردۂ خفا میں ہے۔

غرض سائنسی نقطۂ نظر سے اشیار کا ظاہری علم بہت ہی مفصل ہے جو بے شمار دفتروں پر مشتمل ہے اور ہر علم وفن سے متعلق لٹریچر کا ایک انبار وجود میں آچکا ہے۔ موجودہ سائنس ہر چیز کا

نہایت باریک بینی سے جائزہ لے کر ظاہری اعتبار سے مادہ کے بہت سے اسرار بے نقاب کر چکی ہے اور مختلف سائنسی علوم کی تحقیقات سے دنیا کی لائبریریاں بھر چکی ہیں مگر جہاں تک اشیاء کے باطن یا ان کی اصل کنہ و حقیقت کا تعلق ہے انسانی علم درجۂ صفر میں ہے۔ کیونکہ سائنسی تحقیقات، محسوسات (حواس خمسہ) کے تابع ہیں اور محسوسات کا دائرہ محدود ہے۔ جو اشیاء کے ظاہری علم ہی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، ان کی اصلیت سے واقف نہیں ہو سکتا اور سائنسی نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک مسلم حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور فلسفی مصنف جوڈ نے اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کیا ہے: سائنس ہر چیز کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنے کے قابل تو ہے، لیکن وہ کسی بھی چیز کے بارے میں مکمل صداقت (یا حقیقت) بیان نہیں کر سکتی۔

**Science is competent to tell us something about everyt hing , but it cannot tell us the whole truth about anything.**

اسی بنا پر قرآن حکیم میں علم انسانی کو باوجود اس کے وسیع تر حصول کے "علم قلیل" کہا گیا ہے۔ یعنی علم انسانی خواہ وہ ظاہری اعتبار سے کتنا ہی وسیع ہو جائے حقیقت کے لحاظ سے علم قلیل ہی رہے گا۔ علم انسانی کے "قلیل" ہونے کا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنے حواس کی محدودیت کی بنا پر کسی بھی چیز کی کلی یا حتمی صداقت معلوم نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر یہ مسئلہ کہ روح کی حقیقت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتی ہے؟ چنانچہ قرآن حکیم میں انسانی علم کے قلیل ہونے کی بات روح کی حقیقت جاننے ہی کے سلسلے میں آئی ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ — وہ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے
مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ — ہیں (کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟)، تو



إِلَّا قَلِيلًا (اسراء: ۸۵) — کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم سے (وجود میں آئی) ہے اور تمہیں صرف تھوڑا سا علم دیا گیا ہے (لہذا تم اس کی صحیح کیفیت سمجھ نہیں سکتے)

روح ایک غیر مرئی چیز ہے جس کی مثال بجلی کی رو جیسی ہے۔ بجلی جب ایک قمقمے میں داخل ہوتی ہے تو وہ روشن ہو جاتا ہے اور جب نکل جاتی ہے تو وہ بجھ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح روح بھی جب کسی جسم میں داخل ہوتی ہے تو وہ حرکت کرنے لگتا ہے اور جب نکل جاتی ہے تو مردہ ہو جاتا ہے مگر پھر بھی بجلی ایک لحاظ سے ایک محسوس شے ہے۔ کیونکہ اس کو چھونے سے ایک زبردست جھٹکا لگتا ہے۔ اس کے برعکس روح غیر مرئی ہونے کے ساتھ ساتھ غیر محسوس بھی ہے۔ اسی وجہ سے مادہ پرست اس کے وجود کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ روح کوئی چیز نہیں، بلکہ "زندگی" محض جسم کے کیمیائی تغیرات کا نام ہے۔

### معمہ ہائے حیات

غرض مادیات کی دنیا میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کی حقیقت و ماہیت سے انسان جاہل محض ہے۔ جیسے بجلی اور مقناطیس کی حقیقت کیا ہے اسے انسان نہیں جانتا۔ اسی طرح بجلی کے مثبت (پازیٹو) اور منفی (نگیٹیو) ذرات (یعنی پروٹان اور الکٹران) آپس میں جڑ کر کس طرح جوہر (ایٹم) بنتے ہیں؟ اور پھر مختلف قسم کے جواہر باہمی تعامل کے ذریعہ کس طرح سالمات (مالیکیولس) کی تشکیل کرتے ہیں؟ پھر یہ سالمات کس طرح آپس میں مل کر خلیوں (سیلس) کا روپ دھار لیتے ہیں؟ اور خلیے کس طرح باہم جڑ کے نسیجوں (ٹشوز) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں؟ پھر ان نسیجوں سے کس طرح اعضاء وجود میں آتے ہیں؟ اور مختلف اعضاء مختلف سمتوں میں بڑھتے بڑھتے کس طرح ایک مکمل حیوانی یا انسانی جسم کے روپ میں نمودار ہو جاتے ہیں؟

اور یہ سارا عمل بغیر کسی خالق کے بامقصد اور "خودکارانہ" انداز میں کس طرح تشکیل پاجاتا ہے؛ اس پر خود سائنس داں حیران ہیں اور اس بامقصد مگر خودکارانہ عمل کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حالانکہ انہوں نے حیاتیات (بیالوجی) کے مختلف پہلوؤں پر دفتروں کے دفتر سیاہ کر دیے ہیں[8]۔

ایک بالکل تازہ مثال لیجیے، اسکاٹ لینڈ کے ایک سائنس داں ایان ولمٹ نے "کلوننگ" کے ذریعہ ایک بکری بنادی۔ یعنی بکری کے ایک خلیے سے بغیر جنسی عمل کے اس کی ہم شکل بکری نکال کر کھڑی کردی۔ اس طرح انسان اب کلوننگ کے عمل کے ذریعہ کسی بھی جانور کا ہمزاد (ڈوپلیکیٹ) بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے مگر اس حیرت انگیز کامیابی کے باوجود کلوننگ کے اندرونی عمل سے وہ بالکل اسی طرح لاعلم ہے جس طرح کہ وہ روح کی کیفیت سے ناواقف ہے۔ یعنی انسان کسی بھی چیز کا محض ظاہری علم رکھتا ہے اور اس کی اصل کُنہ وحقیقت سے جاہل محض ہے[9]۔

## تجرباتی علوم قابل حجت

غرض علم الاشیاء کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ چنانچہ ظاہری اعتبار سے انسان دنیا کی ہر چیز کی تفصیلی معرفت حاصل کرتا ہے اور اس سے مادی استفادہ کرتا ہے۔ مگر باطنی اعتبار سے وہ کسی بھی چیز کی کلی یا حتمی صداقت سے واقف نہیں ہے۔ کیونکہ انسان کو یہ علم دیا ہی نہیں گیا۔ بلکہ انسان کو جو علم دیا گیا ہے وہ صرف "ناموں" کا علم ہے جسے قرآن میں "اسماء" کہا گیا ہے۔ (بقرہ: ۳۱) لہٰذا وہ موجوداتِ عالم کے "حقائق" تک نہیں پہنچ سکتا[10]۔ انسان پر حجت قائم ہوتی ہے وہ "علم ظاہر" کی رو سے مشاہدات وتجربات کی روشنی میں ہے اور یہ علم قرآن کی نظر میں معتبر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طبیعی علوم (فزیکل سائنسز) تجرباتی علوم ہونے کی بنا پر اپنی ہیئت و ماہیت میں عمرانی علوم (سوشل سائنسز) سے یکسر مختلف ہیں۔ چنانچہ عمرانی علوم کے ذریعہ اب تک کسی حتمی صداقت یا کسی "قانون" تک رسائی نہیں ہوسکی ہے۔ بخلاف تجرباتی علوم کے جو ایسے اصول



وکلیات پر مشتمل ہیں جن کی بنیاد استقرار پر ہے اور جو اصول وضوابط استقرار کی بنیاد پر مدون کیے جاتے ہیں وہ کبھی غلط نہیں ہوسکتے۔ تجرباتی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ یہ علوم "علت ومعلول" کے تابع ہیں اور ان سے نتائج ہمیشہ یکساں قسم کے نکلتے ہیں۔ کیونکہ ان کے "قوانین" باضابطہ ہیں۔ جن میں کبھی انتشار یا بدنظمی دکھائی نہیں دیتی۔ طبیعیات (فزکس) اور کیمیا (کیمسٹری) کے اکثر مسائل اسی قسم کے ہیں اور ان میں حیاتیات (بیالوجی) اور طبی سائنس (میڈیکل سائنس) کے ان اصول وکلیات کو بھی داخل کیا جاسکتا ہے جو تجربات کے دائرے میں آتے ہوں۔

## سائنس کی دو قسمیں

واضح رہے سائنسی علوم کی دو قسمیں ہیں: ایک نظریاتی اور دوسرے تجرباتی۔ نظریات سے مراد وہ مفروضات (ہائی پوتھیس) ہیں جو ابھی مشاہدات وتجربات کے دائرہ میں نہ آئے ہوں۔ بلکہ وہ محض ظن وتخمین کے درجہ میں ہوں اور سائنسی نظریات میں ردوبدل یا "ارتقاء" جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسی قسم کے مفروضات میں ہوتا ہے جو یا تو ابھی زیر مشاہدہ ہوں یا کسی رکاوٹ کے باعث سرے سے کوئی تجربہ ومشاہدہ کرنا ممکن ہی نہ ہو۔ نیز کسی چیز کے بارے میں پہلے ایک "اجمالی علم" حاصل ہوتا ہے اور پھر مزید تجربات کے بعد اس کے بعض دیگر پہلو جو پہلے مستور تھے سامنے آتے ہیں تو اس چیز کا علم "تفصیلی" بن جاتا ہے، اس طرح کہ مذکورہ بالا اجمال اور تفصیل میں کوئی تضاد نہ ہو۔ گویا کہ جدید تجربات نے سابقہ تجربات کو غلط قرار نہیں دیا۔ بلکہ اجمالی علم کو تفصیلی کر دیا۔ مگر عوام کو دھوکا ہوجاتا ہے کہ سائنس کے نظریات بدل گئے۔ چنانچہ آپ پوری تاریخ سائنس کا جائزہ لیجیے آپ کو کوئی ایسی مثال نہیں ملے گی جو تجرباتی یا استقرائی اعتبا سے ایک تجرباتی حقیقت کو دوسری تجرباتی حقیقت سے غلط ثابت کر دیا ہو۔ مثال کے طور پر آب (پانی) کے ایک سالمے (مالیکیول) کو توڑیے تو اس سے ہمیشہ ہائیڈروجن کے دو اور آکسیجن کا ایک ایٹم برآمد ہوگا۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے ایک سالمے کا تجزیہ کیجیے تو اس سے ہمیشہ آکسیجن کے

دو جوہر اور کاربن کا ایک جوہر ہاتھ آئے گا۔ اسی طرح نمک کے ایک سالمے سے سوڈیم اور کلورین کا ایک ایک جوہر حاصل ہوگا۔ گلوکوز کے ایک سالمے میں کاربن کے ۶، آکسیجن کے ۶ اور ہائیڈروجن کے ۱۲ جوہر ہوتے ہیں۔ ہوا میں ۵/۴ نائٹروجن اور ۵/۱ آکسیجن پائی جاتی ہے۔ حیوانی اور نباتاتی اجسام میں پایا جانے والا "زندہ اور متحرک مادہ" (پروٹوپلازم) غالب طور پر ۱۴ عناصر پر مشتمل ہے جو مٹی کا خلاصہ ہے۔ یہ سب تجرباتی حقائق ہیں جو دو اور دو چار کی طرح ثابت اور سائنسی دنیا کے "مسلمات" ہیں۔

اسی طرح حیوانات سانس کے ذریعہ آکسیجن اپنے جسموں میں داخل کرکے کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ جب کہ پیڑ پودوں میں یہ عمل اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرکے آکسیجن خارج کرتے ہیں اور اس دو طرفہ عمل اور "تبادلے" کے باعث فضا کی آکسیجن کا توازن ہمیشہ قائم رہتا ہے ورنہ تمام حیوانات دم گھٹ کر مر جاتے۔ چنانچہ یہ حقیقت لیبوریٹریوں میں مسلسل تحقیق کے بعد سامنے آئی ہے۔ اسی طرح پیڑ پودوں کی پتیوں میں ہرے رنگ کا ایک مادہ پایا جاتا ہے جسے "کلوروفل" کہا جاتا ہے۔ پتیوں کے خلیوں میں پایا جانے والا یہ مادہ سورج کی روشنی میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور جڑوں کے ذریعہ جذب کردہ پانی کو آمیزہ کرکے مواد نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) تیار کرتا ہے جو حیوانات اور خاص کر انسان کی بنیادی غذا ہے[۱۱]۔

اس قسم کے یہ تمام حقائق ہیں جو تجرباتی اور ثابت شدہ ہونے کی بنا پر قوانین قدرت کا درجہ رکھتے ہیں اور دنیائے سائنس میں ان حقائق و ضوابط کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیبوریٹریوں میں رات دن ان پر مسلسل تجربات ہو رہے ہیں لہٰذا ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہے اور یہ مسلمات صدہا سال کے مسلسل غور و فکر اور تحقیقات کے نتائج ہیں جن میں تبدیلی محال ہے۔

**فطرت و شریعت میں ایک مشابہت** جو لوگ سائنسی علوم و مسائل کو بدلتے ہوئے



نظریات کا نام دیتے ہیں وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کر سکتے ہیں جو تجرباتی علوم و حقائق سے تعلق رکھتی ہو، سوائے بعض مفروضاتی امور کے، مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا تبدیلی جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ مفروضات ہی میں ہوتی ہے، جو مشاہدات و تجربات کے دائرہ میں نہ آتے ہوں، بلکہ قیاسی امور پر مبنی ہوں۔ اصل میں کوئی بھی سائنس داں مختلف مادی اشیاء اور ان کے نظاموں میں ربط و تعلق پیدا کرنے کے لئے بطور توجیہ و تاویل چند مفروضات قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جس طرح کہ خود علمائے شریعت مختلف شرعی امور و مسائل میں ربط و تعلق پیدا کرنے کی غرض سے مختلف قسم کی تاویلات کا سہارا لیتے ہیں اور اس قسم کی تاویلات چونکہ "منصوص" نہیں ہوتیں اس لئے ان میں "اختلاف رائے" ہوسکتا ہے اور اس قسم کی رائیں "تبدیل" بھی ہوسکتی ہیں۔

یہی حال دنیائے سائنس کا بھی ہے۔ مگر اس قسم کے مفروضات اور قیاسی امور کے باعث جو تبدیلیاں عمل میں آتی ہیں ان کی وجہ سے پوری سائنسی تحقیقات کو مہمل یا ناقابل استدلال قرار دئے جانے کا فرمان یا "فتویٰ" صادر نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح کہ کسی قیاسی و اجتہادی مسئلے میں حکم بدل جانے کی وجہ سے پوری فقہ کو ناقابل اعتبار قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ تجرباتی حقائق کو "نصوص سائنس" کا درجہ دیتے ہوئے ان سے استدلال کرنا ایک صحیح اور معقول اصول ہے ورنہ ایک ایسی تشکیک جنم لے گی جو کسی بھی چیز کو دلیل و حجت کے درجے میں باقی نہیں رکھے گی۔ بلکہ وہ تمام استدلالات جو علمائے شریعت منصوص مسائل کی عدم موجودگی کی بنا پر قیاسی و اجتہادی طور پر کرتے ہیں وہ بھی مشکوک اور ناقابل قبول ہو جائیں گے۔

حاصل یہ کہ جس طرح قیاس و اجتہاد میں تبدیلی ہوسکتی ہے اور نصوص کی عدم موجودگی کی بنا پر مختلف قسم کی "تاویلیں" کی جاسکتی ہیں، اسی طرح "مشاہدات و تجربات" کے عدم امکان

کے باعث نظام فطرت کے بارے میں بھی بعض قیاسات و مفروضات قائم کئے جاتے ہیں جو آئندہ چل کر صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، مگر اس قسم کے "تغیرات" کے باعث سائنس کے تجرباتی حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ جس طرح شرعی مسائل میں علمائے امت کا "اجماع" حجت ہے، اسی طرح طبیعی مسائل میں سائنس دانوں کا متفقہ فیصلہ بھی حجت ہے، جس کو مردود قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ (باقی)

---

## حواشی

لہ ماخوذ از فزکس ٹوڈے (Physics Today) ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا ص ۱۰۸، مطبوعہ شکاگو، ۱۹۹۵ء ٹہ Oxford Illustrated Encyclopaedia , Vol8, P 63,

1993 ٹہ Encyclopaedia Britannica, Vol 6 P 190 , 1983

ٹہ The World Book Encyclopaedia, Vol 12, P 69-70, 1990

ٹہ حوالہ مذکور، ص ۷۰۔ ۱ے ٹہ ملاحظہ ہو: ایٹم آپ کا خادم: مطبوعہ انڈین اکیڈمی، نئی دہلی، نیز ملاحظہ ہو ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا، ۱۰/ ۴۲۸۔ ۴۲۷۔ مطبوعہ لندن ٹہ C.E.M. Joad, Guide to Modern Thought , London, P 108 ٹہ اس موضوع پر تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر الکسس کیرل کی کتاب MAN THE UNKNOWN مطبوعہ بمبئی ٹہ اس موضوع پر تفصیل کے لئے دیکھئے راقم السطور کی کتاب "قرآن اور نظام فطرت" مطبوعہ فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور نلہ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے راقم السطور کی کتاب "اسلام کی نشاۃ ثانیہ: قرآن کی نظر میں" مطبوعہ کراچی للہ ان حقائق کی تفصیل اور تحقیقی بحث کے لئے دیکھئے راقم السطور کی کتاب "قرآن حکیم اور علم نباتات" مطبوعہ فرقانیہ اکیڈمی بنگلور۔

---



# مہاراشٹر اور مولانا سید سلیمان ندویؒ

از ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط٭

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی فراست اور لیاقت کو ان کی طالب علمی ہی کے زمانے میں علامہ شبلیؒ نے بھانپ لیا تھا، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ یہ ہونہار طالب علم ان کے پاس ہی رہے۔ وہ سید صاحبؒ کے بزرگوں کو ایک خط میں یہ تلقین فرماتے ہیں:

"آپ لوگ ان کی زندگی (پیشۂ طب میں لگا کر) خراب نہ کیجئے۔ ان کو میرے حوالے کیجئے۔ ان کو خدا نے دوسرے کام کے لئے بنایا ہے۔" (حیات سلیمان ص ۳۰)

ایک دوسرے عزیز کے استفسار پر جواب دیتے ہیں:

"مولوی سید سلیمان چند روز تک میرے ساتھ رہتے تو اچھا ہوتا، وہ جوہر قابل ہیں۔" (خط بنام ابوالکمال سید عبدالحکیم، مکاتیب شبلی حصہ اول، صفحہ ۳۰۴)

ایک موقع پر فرط مسرت میں بھری محفل میں اپنا عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔ (حیات شبلی ص ۴۵۸) اس واقعہ کی تفصیل اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحب کو بتاتے ہوئے علامہ شبلی مرحوم بڑے ناز و فخریہ انداز میں لکھتے ہیں:

"جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا۔ سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اسی وقت اس پر عربی میں لکچر دوں گا۔ غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا

---

٭ "کاشانہ" کل گاؤں، ضلع ایوت محل۔ مہاراشٹر۔

اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ محو حیرت تھا اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفریں کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہوگئی"۔

(مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۵۸ - ۱۵۷)

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے استاد علامہ شبلی مرحوم کی خدمت و تربیت میں ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۳ء تقریباً آٹھ سال گزارے تھے۔ اس مصاحبت میں پدرانہ شفقت اور استادانہ الفت دونوں سے آپ متمتع ہوتے رہے، مولانا سید سلیمان ندوی کے نام علامہ شبلی کے خطوط سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ سید صاحبؒ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

مولانا سلیمان ندویؒ کی صلاحیتوں اور خوبیوں ہی کی بنا پر علامہ شبلی مرحوم نے ان کو "سیرۃ النبیؐ" کی تالیف و تدوین کی مجلس کا نہ صرف رکن بنایا بلکہ تحقیق کے دشوار ترین کام میں اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے اپنے پاس بمبئی بلالیا۔ شبلی مرحوم جس قسم کی سیرت تصنیف کرنا چاہتے تھے اور جس کے ذریعہ مستشرقین کے کذب و افترا کو طشت از بام کرنا چاہتے تھے اس کے لئے سارے عالم میں پھیلی ہوئی انگریزوں کی کذب بیانیوں سے بھری ہوئی کتابوں کا سراغ لگا کر ان کے ماخذ تک پہنچنا اور روایتوں کی صحت و عدم صحت کو پرکھنا یہ اتنا دشوار اور محنت طلب کام تھا کہ آج اس کے کرنے کے لئے ایک انجمن یا ادارے کی ضرورت پڑتی۔ ایسے دقت طلب کام کے لئے علامہ شبلی مرحوم کی اولین نظر انتخاب مولانا سید سلیمان ندوی پر پڑی۔ چنانچہ استاد کے حکم پر سید صاحب مولف سیرۃ کا ہاتھ بٹانے کے لئے بمبئی آئے۔ مہاراشٹر میں سید صاحب کا یہ پہلا ورود مسعود تھا۔ حیات سلیمان اور حیات شبلی دونوں میں آپ کی بمبئی میں آمد کی تاریخ کا ذکر نہیں، ہاں! مکاتیب شبلی کے دو خطوط سے ہم ان کی آمد کی تاریخ کا تعین کر سکتے ہیں۔ منشی محمد امین صاحب مہتمم صیغۂ تاریخ بھوپال کے نام ایک خط مرقومہ ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی رقم طراز ہیں:



"سید سلیمان ساتھ رہیں گے خوش نویس اور انگریزی مترجم وغیرہ بھی" (مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۲۳۹)

لیکن فوراً بعد ۶ جون ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"سید سلیمان آگئے" (ایضاً ص ۲۴۱)

ان دونوں خطوط کی روشنی میں اوائل جون کی کوئی تاریخ مولانا سید سلیمان ندوی کے بمبئی پہنچنے کی متعین کی جاسکتی ہے۔ مگر اس دوسرے خط کو "حیات شبلی" میں ۱۶ جون کا مرقومہ گردانا گیا ہے[1]۔ شاہ معین الدین صاحب حیات سلیمان میں غالباً اسی بنیاد پر صحیح تاریخ متعین نہیں کر سکے۔

(دیکھئے حیات سلیمان ص ۷۳، نیچے سے تیسری سطر)

بمبئی میں علامہ شبلی مرحوم نے ان کو سیرت کا جو کام سپرد کیا تھا اس کے متعلق خود سید صاحب رقمطراز ہیں:

"مولانا نے مجھے اس لئے بلوایا کہ میں انہیں روایات کی تلاش اور رواۃ کے ناموں کی تحقیق میں مدد دوں" (حیات شبلی ص ۱۲ - ۷۱۱)

چنانچہ اسی کے پیش نظر سید صاحبؒ نے ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے جو سیرت کے ماخذ اصلی تھے تمام رواۃ کا استقصا کر کے ان کے اسماء الرجال کو مرتب کر دیا تھا، تاکہ روایتوں کے نقد و جرح میں آسانی ہو۔ سیرت النبیؐ جلد اول کے مقدمہ میں مولانا شبلی اس کام کی دقت طلبی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور

[1] معارف: ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو۔

تاحدامکان کدوکاوش کی ہے۔ اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ابن ہشام ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ الگ انتخاب کرلئے، جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا تاکہ جس سلسلۂ روایت کی تحقیق مقصود ہو بہ آسانی ہوجائے۔" (سیرۃ النبی جلد اول طبع چہارم ص ۱۰۱)

بمبئی کے عام شور وغل سے محفوظ کھڑا پارسی کے پاس پالن جی ہوٹل نامی مکان کے ایک بالائی کمرے میں ٹھہر کر سید صاحبؒ نے سیرت کے اس کام کی ابتدا کی تھی۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بمبئی کا یہ پہلا سفر مولانا شبلی کے پاؤں کے حادثے کے بعد ہوا تھا۔ علامہ شبلی مرحوم اپنے مصنوعی پاؤں کا استعمال کرنے لگے تھے۔ اگرچہ یہ ایک سانحہ تھا لیکن اس حادثے نے اردو میں ذکاوات و لطائف کا وافر ذخیرہ چھوڑا ہے۔ سید صاحبؒ فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ کا لطیفہ میں بھول نہیں سکتا۔ میں اور مولانا ۱۹۱۲ء میں بمبئی میں تھے، مولانا مجھے ساتھ لے کر کھانے کے ایک ریسٹران میں گئے۔ کھانے کے اثناء میں خانساماں سے فرمایا کہ "پون" لاؤ، مجھے تعجب ہوا کہ پاؤں تو مولانا لگائے ہیں۔ یہ پھر پاؤں کیسا مانگتے ہیں مڑ کر دیکھا تو خانساماں پاؤ روٹی کے ٹکڑے لا رہا ہے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ بمبئی میں اس کو پون کہتے ہیں۔" (حیات شبلی ص ۴۷۵)

یہ لطیفہ بعد میں سید صاحب کے لئے سامان تحقیق بن گیا اور آپ نے "چند قدیم الفاظ کی نئی تحقیق" میں "پون" کا سراغ لگا کر ثابت کیا کہ یہ پرتگالی لفظ ہے جس کے معنی روٹی کے ہوتے ہیں۔

بمبئی کے اس اولین قیام کے دوران سید صاحب کو جنوب کا سفر بھی درپیش آیا اور وہ مدراس محمڈن کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لئے ۲۵ جولائی ۱۹۱۲ء کو بمبئی سے روانہ ہوئے۔



دوبارہ ۸ اگست ۱۹۱۲ء کو واپسی ہوئی۔ اسی اثناء میں ۵ اگست ۱۹۱۲ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کا اجلاس تھا۔ چونکہ علامہ شبلی مرحوم کو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں کچھ کتابیں دیکھنی تھیں اس لئے مولانا نے خود باوجود شکستہ پائی کے ڈھاکہ کا قصد کیا۔ وہاں سے واپسی کی قطعی تاریخ تو معلوم نہ ہوسکی البتہ شروانی صاحب کے نام ایک خط سے جو مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کا ہے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مولانا مرحوم اگست کے اواخر میں دوبارہ بمبئی پہنچے ہوں گے اور شاگرد واستاد نے دوبارہ سیرت کے کام کو سنبھالا ہوگا۔ اس طرح سید صاحب کا مہاراشٹر کا پہلا سفر سیرت کے مقدس کام کے لئے ہوا جو آئندہ نہایت مفید ثابت ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے دکن کالج کی ملازمت کے لئے مہاراشٹر میں دوبارہ قدم رنجہ فرمایا تھا۔ وہ کسی کالج یا یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نہیں تھے، ان کی تمام تر تعلیم روایتی دینی مدارس میں ہوئی تھی۔ پونا کالج میں پروفیسری کے تقرر کے موقع پر وہی اکیلے غیر سند یافتہ تھے اور ان کے بالمقابل یونیورسٹی کے پانچ سند یافتہ اسکالرس، جن میں دو ایم۔ اے تھے لیکن اس وقت نہ رشوت کا بازار تھا نہ اقرباپرستی۔ پرنسپل انگریز تھا۔ اس کی نگاہ جوہر شناس نے اصلی ہیرے کو بھانپ لیا تھا اور پانچوں سند یافتہ افراد کے مقابلے میں سید صاحب کو اسسٹنٹ پروفیسر کے لئے منتخب کرلیا۔ اس تقرر پر سب محو حیرت اور انگشت بدنداں تھے۔ ایک خط بنام شیخ عبدالقادر میں علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں:

"سید سلیمان ندوی کی کامیابی حیرت انگیز ہے۔ لیکن اصلی حیرت انگیز آپ کا ذوقِ انتخاب ہے بہرحال ایک قابل شخص کی قدر دانی نتیجہ نتائج مفیدہ ہوگی۔" (مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۳۱)

اسی نوید کو ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب کو سناتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سید سلیمان پونا گئے اور جانا ناگزیر تھا۔ سید سلیمان کے مقابلہ میں پانچ بی۔اے تھے جن میں دو ایم۔اے تھے لیکن کوشش کی گئی اور وہی کامیاب رہے۔" (ایضاً ص ۳۰۸)

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس منصب کو اپنے استاد علامہ شبلی مرحوم کے ایما سے قبول کیا تھا۔ علامہ چاہتے تھے کہ الہلال سے سبکدوش ہوکر فراغت والی ملازمت اختیار کریں۔ اس لئے اپنے رسوخ سے پروفیسر عبدالقادر کے ذریعہ پونا کی نوکری دلوادی۔ یہاں پہنچ کر مولانا سید سلیمان معاش سے بے فکر ہوکر سیرت عائشہ کی تالیف میں منہمک ہوگئے۔ خود علامہ شبلی مرحوم انہیں سیرت عائشہ کی تکمیل کے لئے بار بار ہدایت کرتے رہے تھے۔ ایک خط میں رقمطراز ہیں:

"آج بھوپال سے خط آیا ہے۔ حضرت عائشہ کی سوانح کا بڑا تقاضا ہے۔ یعنی جلد تیار کردو تم ایک مدت سے اس میں مصروف ہو... حضرت عائشہ کے متعلق میری خاص معلومات ہیں۔ میں تمہارا مسودہ دیکھتا تو رائے ظاہر کرسکتا۔" (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۱۰)

ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہاں! اسلم جے راجپوری نے بھی تو شاید حضرت عائشہ کی سوانح لکھی ہے۔ اس کو دیکھ لو۔ اس سے بہت الگ رہے یا بہت آگے نکل جائے۔" (ایضاً ص ۱۱۲)

ان ہدایات کے علاوہ مآخذ کی فراہمی اور کتابوں کی نشان دہی میں بھی علامہ شبلی مرحوم برابر سید صاحبؒ کی مدد فرماتے رہے۔ چنانچہ سیرت عائشہ کی تیاری میں جو کتابیں مفید ہوسکتی تھیں بذریعہ خطوط ان کی اطلاع بہم پہنچاتے رہے۔ لکھتے ہیں:

"طبقات میں لغویات زیادہ ہیں اس سے کیا فائدہ۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد کافی ہیں... فن درایت کی وہ خاص موجد ہیں۔ ان کو خوب پھیلا کر لکھ سکتے ہیں۔ فقہیات اور اعتقادات میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۲)



ترمذی شریف کو مرجع بنانے کی ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ترمذی میں اکثر مسائل میں حضرت عائشہؓ کے اجتہادی مسائل کی تصریح ہے ان کو الگ یکجا جمع کرلیا ہے یا نہیں۔" (ایضاً ص ۱۱۳)

پونا کی ملازمت کے دوران ہی علامہ شبلی مرحوم نے سید صاحبؒ کو سیرت عائشہ کی تیاری کے لئے بعض نادر کتابیں فراہم کردی تھیں، جن میں علامہ سیوطیؒ کی مشہور کتاب "عین الاصابہ فیما استدرکتہ السیدۃ عائشہ علی الصحابہ" اور "مسند عائشہؓ" تھیں۔ استدراک عائشہ ایک مختصر لیکن نہایت اہم قلمی رسالہ تھا جسے علامہ شبلی مرحوم نے بہ ہزار دقت مولوی شیر علی صاحب کے توسط سے عاریتاً حاصل کیا تھا۔ اس رسالے کے متعلق خود سید صاحب رقمطراز ہیں کہ "یہ ایک مختصر رسالہ ہے مگر اس میں وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں حضرت عائشہؓ نے اپنے معاصرین کی غلطیاں یا غلط فہمیاں ظاہر کی ہیں۔" (سیرت عائشہ ص ۱۴۴)

اس تصنیف کے لئے سید صاحبؒ نے تلاش و تفحص میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں چھوڑا۔ عربی کے فارسی تراجم کے حذف و اضافے اور التباسات اور مستشرقین (میور اور مارگیولیوس) کے تلبیسات و تکذیبات کا پردہ چاک کرنے کے لئے جس عرق ریزی سے تحقیق کی ہے اور جن جن مراجع و مصادر کو کھنگالا ہے یہ بس ان ہی کا کام ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم سید صاحب ہی کی زبانی بیان فرماتے ہیں:

"حالات (حضرت عائشہؓ کے سوانحی حالات) بہت متفرق اور منتشر تھے لیکن ان کو ڈھونڈھ کر اس طرح یکجا کیا ہے جس طرح چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے کوئی چنے... کوئی واقعہ بغیر حوالے کے نہیں لکھا گیا ہے اس لئے شروع سے آخر تک اس میں اتنے حوالے ہیں کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کسی عربی مدرسہ کے فارغ التحصیل عالم کی لکھی ہوئی ہے بلکہ یہ

ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح کسی یونیورسٹی کا ایک ماہر تحقیق حوالوں کی پوری پابندی کے ساتھ کوئی محققانہ کتاب لکھتا ہے اسی طرح یہ سیرت لکھی گئی ہے۔ جس کو پڑھ کر بیسویں صدی کا ذہن پوری طرح مطمئن ہو سکتا ہے"۔ (مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف: ایک مطالعہ حصہ اول ص ۱۴۶)

بہرحال! پونا میں رہتے ہوئے اس صبر آزما کام کو پورا کرنے کے لئے انہیں اس ملازمت کی وجہ سے فراغت حاصل ہوگئی تھی اس لئے وہ اپنا باقی ماندہ وقت کتاب کی تیاری میں صرف کرتے رہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"غرض تین گھنٹے کالج کی نذر باقی تمام شب و روز فرصت۔ سیرت عائشہ لکھ رہا ہوں۔ اس کے لئے مواد بہت نہیں ہے لیکن ایک ضروری کام ہے اس لئے مختصر ہوگی"۔ (خط بنام سید عبدالحکیم بحوالہ حیات سلیمان ص ۶۴)

لیکن پونا کی ملازمت کے دوران ہی سیرت عائشہؓ کا کام اتنا بڑھ گیا اور مراجع و مصادر اتنے ملتے گئے کہ پوری کتاب ۱۹۲۰ء میں ہی مکمل ہو سکی۔

اردو میں سیر کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں علاوہ "سیرۃ النبی" کے ان میں کوئی سیرت عائشہ جیسی تحقیقی کتاب نہیں۔ بلکہ عربی میں بھی شاید سیرت عائشہ پر ایسی کتاب مشکل ہی سے ملے۔ اس طرح سیرت عائشہ کی تیاری میں سید صاحب کو پونا کی ملازمت سے کافی فائدہ پہنچا۔ یہاں کا قیام "ارض القرآن" کے بعض مباحث کی تکمیل کے لئے بھی مفید ثابت ہوا۔ یہاں ایک یہودی سے عبرانی سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ محولہ بالا خط میں وہ عبدالحکیم صاحب کو لکھتے ہیں:

"میں نے یہاں ایک یہودی سے عبرانی پڑھنی شروع کی ہے اور انگریزی کو تقویت دے رہا ہوں"۔ (ایضاً ص ۶۵)



سید صباح الدین عبدالرحمن اپنی کتاب "مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف" میں رقمطراز ہیں:

"اس کتاب (ارض القرآن) کی تیاری کے سلسلہ میں سید صاحب نے عبرانی زبان بھی کچھ سیکھنے کی کوشش کی تاکہ توراۃ کے ناموں کے تلفظ اور فقروں کو آسانی سے سمجھ سکیں"۔ (ص ۶۴)

لیکن سید صاحب کو جلد ہی ترک ملازمت کرنی پڑی۔ بقول شاہ معین الدین احمد ندوی "ابھی سید صاحب کو پونا میں صرف ڈیڑھ سال گزرا تھا کہ مولانا شبلی کا وقت آخر ہوگیا۔ ان کو استاد کی وصیت کے مطابق ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کے لئے پونا کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڈھ آجانا پڑا"۔ (حیات سلیمان ص ۶۸-۶۷) استعفے کے مراحل طے ہونے تک سید صاحب برابر دارالمصنفین آتے رہے اور اس کے بارے میں مشاہیر اہل علم سے استصواب بھی فرماتے رہے جن میں مہاراشٹر کے مولوی عبدالحق ناظم انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کالج پونا کے پروفیسر عبدالقادر صاحب اور بمبئی کے محافظ حجاج مولوی عبداللہ صاحب کے نام اہم ہیں۔ بالآخر سید صاحب استعفے کی منظوری کے بعد نومبر ۱۹۱۵ء میں اعظم گڈھ پہنچ گئے۔

بادی النظر میں استعفے کے بعد سید صاحب کا تعلق مہاراشٹر سے منقطع ہو چکا تھا لیکن دراصل اس سے ان کا جذباتی تعلق ہمیشہ رہا۔ یہاں کی ادبی، سماجی، معاشرتی و سیاسی تحریکیں ان کے بحر جذبات کو متموج و متلاطم کرتی رہیں۔ چنانچہ اردو والوں کی سرد مہری وبے حسی کی وجہ سے اردو انسائیکلوپیڈیا کی تحریک نے جب دم توڑ دیا اور اس کے غم کا اثر ابھی کم بھی نہیں ہوا تھا کہ ناگپور سے ڈاکٹر شری دھر وینکٹیش کیتکر کی ادارت میں شایع

ہونے والی ضخیم مراٹھی انسائیکلوپیڈیا کا اشتہار یو۔پی میں ان کی نظروں سے گذرا تو ان کی غیرت کو ٹھیس پہنچی۔ معارف کے ۱۹۱۸ء کے شذرات میں اپنے غم و غصہ کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

"دوستو! آؤ آج ہم تمہیں ایک بلند ہمت قوم کا قصہ سُناتے ہیں۔ مراٹھی زبان بولنے اور سمجھنے والے شاید پونا سے ناگپور تک ایک کروڑ سے زیادہ نہ ہوں گے لیکن اپنی زبان کی ترقی کے لئے ان کی کوششیں تمام ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں سے بھی زیادہ ہیں مسلمان سیاسی معاملات میں ۲۱ کروڑ ہندوؤں کی تعداد سے ڈرتے ہیں لیکن حقیقت میں سوال تعداد کا نہیں بلکہ قوت کا ہے۔ ۷ کروڑ مسلمان اگر ۲۱ کروڑ ہندوؤں کی ہندی زبان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تو کیا ایک کروڑ مرہٹے ڈیڑھ کروڑ بنگالیوں کی زبان کا مقابلہ کرسکتے ہیں؟

ناگپور میں مراٹھی زبان کا انسائیکلوپیڈیا لکھنے کی تحریک کچھ دنوں سے شروع ہوئی ہے مراٹھی انسائیکلوپیڈیا کا نام "مہاراشٹری دیان کوش" تجویز ہوا ہے۔ اس کی بیس (۲۰) جلدیں ہوں گی ۱۰ ہزار صفحے ہوں گے۔ سو روپے قیمت ہوگی۔۔۔ اس میں دو سو (۲۰۰) مضمون نگار کام کر رہے ہیں ۱۹۲۲ء میں تمام جلدیں مکمل ہو جائیں گی۔۔۔۔ بلیال ملک کرناٹک کا ہمارا ایک پرجوش عزیز جو اردو پر جان دیتا ہے، اس غم و غصہ میں کہ اس کی زبان میں کیوں یہ سرمایہ پیدا نہ ہوا، اس نے اردو چھوڑ کر مراٹھی شروع کر دی ہے کہ ایسی کشتی پر کیوں نہ سوار ہو جس سے اتنا بڑا سمندر قبضہ میں آتا ہے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی کی زندگی میں ایسے واقعات بارہا آئے ہیں کہ مہاراشٹر کے کسی نہ کسی واقعہ نے انہیں ضرور متاثر کیا بلکہ بعض مواقع پر ملت بیضاء کے سرد احساسات، جمود و سکوت پرور کیفیات کے بالمقابل دیگر اقوام کے گرما دینے والے جذبات کی انہوں نے



قدر کی۔ مراٹھی انسائیکلوپیڈیا پر ان کے جو تاثرات اوپر نقل کئے گئے وہ اس کی دلیل ہیں۔ کانگریس اور لیگ کے کلکتہ اجلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محمد علی کی والدہ کا جلوس مسلمانوں کے نعرہ اللہ اکبر اور ہندوؤں کی 'مائی جی کی جے' کی آواز کے ساتھ بڑھتا تھا۔ مجھے گو شیخ کافر کہیئے لیکن برہمنوں کا کلمۂ محبت (یعنی مائی جی کی جے) میرے دل سے لگتا تھا۔" (حیات سلیمان ص ۱۶۵)

مارچ ۱۹۱۸ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے کی تھی۔ یہ جلسہ اتنا کامیاب رہا کہ سال گذشتہ کلکتہ میں ہوئے اجلاس کی ساری کلفتیں اور افسردگی ناگپور کے اس جلسہ سے زائل ہوگئیں۔ ندوۃ العلماء کے اس جلسہ میں سید صاحب شریک تھے۔ اپریل ۱۹۱۸ء کے شذرات میں وہاں کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ جوش و اژدحام اور ولولہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ آج ناگپور کی تاریخ بدل جائے گی ۔۔۔۔ چندے کی تحریک ہوئی تو۔۔۔ ہم نے اپنے انہی غریب بھائیوں میں وہ جوش دیکھا کہ تین (۳) میزیں مختلف مقامات پر بچھائی گئی تھیں لیکن حالت یہ تھی کہ ہر جگہ ایک بھیڑ لگی تھی اور بہ مشکل یہ مہلت کارکنوں کو ملتی تھی کہ وہ ان کے صحیح نام اور پتے لکھ سکیں۔

وہ سماں نہ بھولے گا جب ایک ہندو برہمن نے اپنی دس روپے کی رقم ان الفاظ کے ساتھ پیش کی کہ "میں یہ حقیر رقم ان احسانات کی یادگار میں دیتا ہوں جو مسلمان بادشاہوں نے ہمارے اسلاف پر کئے تھے اور یہ روپیہ اسی فارسی زبان کی تعلیم پر صرف کیا جاوے جس میں ہمارے بزرگوں کو سلاطین سے سندیں ملتی تھیں۔"

زبان کی قدر شناسی اور احسان نافراموشی کی مثال اس دور میں جب کہ عناد و تفرقہ کا

زہر چاروں سو پھیلایا جا رہا تھا سید صاحب کو ناگپور کے جلسہ میں دیکھنے کو ملی۔ اس برہمن کے الفاظ میں جو عجز وانکسار چھلک رہا تھا سید صاحب کو یقیناً متاثر کر گیا اور بے ساختہ ان کے نوک قلم پر بطور تحسین یہ الفاظ آگئے۔ سطحی اور سرسری طور پر تو یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ مسلمانوں کے ہزاروں روپیوں کے چندے میں ان دس روپیوں کی کیا وقعت۔ لیکن سید صاحب ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل پر نہایت گہرائی سے سوچنے کے عادی تھے اور معمولی معمولی باتوں سے متاثر ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک برہمن کی دس روپے کی معمولی امداد نے ان کے جوش و ولولہ کو بھڑکا دیا اور سرزمین مہاراشٹر سے وہ افسردہ خاطری کی بجائے شاداں و فرحاں لوٹے۔

ندوۃ العلماء کے ناگپور اجلاس سے ہی صحیح معنوں میں سید صاحب کا رُخ سیاست کی سمت مڑا۔ ہوا یوں کہ اس اجلاس میں شریک ہونے کے بعد وہ چھندواڑہ گئے۔ وہاں مسجد میں مولانا محمد علی جوہر سے ملاقات ہوئی۔ ملت کے یہ دو عظیم سپوت ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اور بقول حمیدہ ریاض "اس کے بعد دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا" (حمیدہ ریاض: "محمد علی جوہر"۔ ناگپور ۱۹۸۸ء ص ۲۵۲)

مولانا سلیمان ندویؒ سیاست کے بکھیڑوں سے ہمیشہ دور رہنے کے عادی تھے۔ وہ اس کوچہ میں قدم رکھنا پسند نہیں فرماتے تھے تاہم ایک جگہ لکھتے ہیں:

"پالیٹکس بڑی گندہ چیز ہے۔ میں نے کبھی اس خرقۂ مے آلودہ کو خود سے نہیں پہنا۔ کبھی محمد علی نے پہنا دیا۔ کبھی شوکت علی نے اور جب کسی نے پہنایا تو میں نے فوراً اتار پھینکا ؎

حافظ کہ خود نہ پوشید ایں خرقۂ مے آلود　　اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را"



لیکن مفاد ملت کے پیش نظر بادل ناخواستہ سہی عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اسی لئے "حیات سلیمان" کے باب چہارم کا عنوان "قومی و سیاسی خدمات" ہے۔ چنانچہ ایک ملی مسئلہ کو لے کر ایک سیاسی وفد میں شریک ہو کر فرنگستان تشریف لے گئے۔ جلیان والا باغ کے پُرتشدد ظالمانہ واقعات کے بعد ہندوستان میں سیاسی اور سماجی سطح پر ہندو مسلم جذباتی ہم آہنگی بہت بڑھ گئی تھی۔ ان دونوں قوموں میں اتحاد و اتفاق کی لہر ایسی دوڑی کہ دونوں یک جان و دو قالب نظر آنے لگیں۔ امرت سر میں کانگریس اور خلافت کے اجلاس میں ان دونوں قوموں کا باہمی اتحاد دیکھنے کے لائق تھا۔ علی برادران، مہاتما گاندھی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی کوشش سے احیائے خلافت کی تحریک میں ہندوؤں نے اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہندو۔ مسلمان لیڈروں کے مشورے سے خلافت عثمانیہ کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے ایک وفد تشکیل دے کر سنہ ۱۹۲۰ء میں لندن اور فرانس بھیجا گیا۔ وفد کے اراکین میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا سید سلیمان ندوی، سید حسین، حسن محمد حیات اور مولوی ابو القاسم تھے۔ سید صاحب کے ذمہ خلافت کی مذہبی ترجمانی تھی۔ یادرفتگاں (صفحہ ۵۹) میں سید صاحب رقم طراز ہیں کہ اس وفد میں ان کا نام مولانا عبدالحئی فرنگی محلی ہی نے تجویز کیا تھا۔ ان کی ہدایت تھی کہ وہ اس وفد کی روداد ہر ہفتے ان کو لکھتے رہیں۔ وفد کی روانگی باب مکہ (بمبئی) سے ہوئی۔ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں لوک مانیہ تلک، پنڈت مدن موہن مالویہ اور مہاتما گاندھی کی نیک خواہشات کے ساتھ یہ وفد روانہ ہوا۔ اسٹیشن سے لے کر مستقر تک انسانوں کا وہ ہجوم تھا کہ کبھی نہیں پہلے ایسا شاندار استقبال نہیں دیکھا گیا۔ لوک مانیہ تلک کی صدارت میں ایک الوداعی جلسہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ سید صاحب نے اس الوداعی تقریب میں ایک گھنٹہ تک تقریر کی

بقول ان کے "خدا نے در و دیوار سے اس کا اثر نمایاں کیا"۔ صدارتی تقریر میں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے لوک مانیہ تلک نے نہایت پُرجوش لہجے میں کہا تھا:

"یہ متحدہ ہندوستان کی طرف سے ایک پیام ہے۔ یہ وفد دنیا کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ مشرق کی طرف سے مغرب کے مظالم کے خلاف پہلی صدا ہے تنبیہی آواز ہے"۔ (رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی: لاہور ۱۹۵۰ء ص ۲۳۲)

یہ وفد حقیقتاً مضطرب القلب دنیائے اسلام کے جذبات و احساسات کا فرنگستان میں ترجمان بن کر گیا تھا۔ موحدین کی جانب سے مثلیثین کو ندائے رجز، اور بقول پوپ "مذہب کی طرف سے الحاد اور روحانیت کی طرف سے مادہ پرستی کو اعلان جنگ تھا"۔ (مولانا محمد علی کی یاد میں ص ۱۲) اس وفد کی روانگی کے وقت شہر بمبئی کی ہندو مسلم ہر دو قوموں میں جو جوش و ولولہ پایا گیا وہ قابلِ دید تھا۔ "نعرۂ تکبیر کی گونج بار بار بلند ہو رہی تھی۔ ہر طرف پھولوں کی بارش تھی، پُرامید نگاہیں وفد کے ارکان کے چہروں پر جمی تھیں۔ مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور سیٹھ چھوٹانی نے سب کو سینوں سے لگا کر دعائیں دیں"۔ یہ وفد فرنگستان میں متواتر ۸ ماہ قیام کرکے ہندوستان ناکام لوٹا۔ بجھے بجھے سے چہرے لیکن دلوں میں جذبات کا تلاطم۔ اسی وجہ سے لندن سے لوٹنے کے فوراً بعد کانگریس کمیٹی کا اجلاس ناگپور میں رکھا گیا۔ جس میں ترکِ موالات کی تجاویز منظور کی گئی تھیں۔ کانگریس کے لبرل حضرات اسے "غیر آئینی روش" کہہ رہے تھے۔ ان میں سی۔ آر۔ داس، محمد علی جناح اور پنڈت مدن موہن مالویہ پیش پیش تھے۔ لیکن محمد علی کو صرف سی۔ آر۔ داس کی فکر تھی۔ آخرکار انہیں راضی کر لیا گیا۔ ناگپور کانگریس کے اس اجلاس میں مولانا سید سلیمان ندوی بھی شریک تھے۔



سید صاحب اگرچہ خالص علمی ذوق رکھتے تھے۔ لیکن وطن کی حالت، مسلمانوں کی بے چینی اور وفد کی یوروپ سے ناکام واپسی نے انہیں سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے نبرد آزما ہونا سکھا دیا تھا اور وہ کبھی کبھی اپنے گوشۂ عافیت (علمی کاموں) سے نکل کر اس دنگل (سیاست) میں کود جایا کرتے تھے۔ ناگپور کے کانگریس اجلاس میں ان کی شرکت اس پر دال ہے۔ ناگپور کا یہ اجلاس ۲۶ دسمبر ۱۹۲۰ء سے شروع ہونے والا تھا۔ اس جلسہ میں گرما گرم بحثیں رہیں بعض تجاویز مثلاً "ترکِ موالات" وغیرہ کو قبول کرنے میں لالہ لاجپت رائے مذبذب اور مدن موہن مالویہ متردد تھے۔ محمد علی جناح بھی اس معاملہ میں مخالفین کے گروہ میں تھے۔ محمد علی جوہر، سید صاحب، دیگر مسلمان رہنما اور مہاتما گاندھی کے ایڑی چوٹی کا زور لگا دینے کی وجہ سے بالآخر ذیل کی تجاویز منظور ہوئیں۔

(۱) حکومت خود مختاری (۲) پنجاب کے مظالم کی تلافی (۳) ترکوں کی حکومت کی بحالی (۴) خلافت کا مطالبہ اور (۵) ترکِ موالات۔ اس آخری تجویز کو کانگریس کے ثقہ لیڈر ماننے کو تیار نہیں تھے۔ پھر بھی یہ تجاویز منظور ہو گئیں اور ملک بھر میں ہندو۔ مسلمانوں نے مل کر اس تحریک کو کامیاب بنایا۔ ناگپور کانگریس کے بعد اعظم گڈھ ترکِ موالات کی تحریک کا مرکز بن گیا۔ اس زمانے میں کانگریس کے مقتدر لیڈروں نے دارالمصنفین میں قیام کیا جن کی میزبانی کے فرائض دارالمصنفین نے انجام دئے۔ ناگپور کانگریس کی ترکِ موالات کی تجویز ہندو مسلم اتحاد کا سبب بن گئی اور تحریک ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ اس اتحاد کا تجزیہ کرتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو رقمطراز ہیں:

"دیہات میں لفظ "خلافت" کے بہت ہی عجیب معنی سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ لفظ "خلاف" سے بنا ہے۔ جس کے معنی مخالفت کے ہیں۔ گویا خلافت سے مطلب ہے

"حکومت کی مخالفت"۔ (پنڈت جواہر لعل نہرو: میری کہانی حصہ اول ص ۱۲۳)
ترکِ موالات بقول سیکے اس احساس کا نام ہے "کہ بدیسی حکمراں قوت کو اس کی حکومت کو قائم رکھنے میں مدد دینا ایک شرمناک فعل ہے"۔ (ایضاً ص ۱۱۹) اس اجلاس کے بعد گاندھی جی، محمد علی جوہر اور سید صاحب نے منتشر لوگوں کے کانوں میں ایسا صور پھونکا کہ خطاب یافتوں نے خطابات واپس کر دئے۔ انگریزی کپڑوں کا بائیکاٹ کیا گیا اور جو لوگ مانچسٹر کے خوبصورت کپڑوں میں ملبوس رہتے تھے وہ کھدر پوش ہوگئے۔ ہندو۔ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا ایسا روح پرور نظارہ پھر کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ ناگپور کانگریس کا یہ جلسہ سید صاحب کے لئے باب سیاست ثابت ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے بارہا اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کو بدنام کرنے اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خاطر آئے دن ڈھونڈ ڈھونڈ کر مسلم سلاطین کی برائیوں کو منظر عام پر مختلف طریقوں سے لایا جا رہا ہے۔ یہ ہندو مسلم منافرت کو بڑھانے میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔ منافرت کے اس زہر کو پھیلانے میں مہاراشٹر کی تنظیمیں بھی پیش پیش تھیں۔ چونکہ مہاراشٹر سے ان کو ذہنی وابستگی تھی اس لئے یہاں بدامنی پھیلانے کے جو منصوبے تیار کئے جا رہے تھے سید صاحب نے ان کا پردہ فاش کیا۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے معارف میں تحریر فرماتے ہیں:

"تلک مہاراج نے عام ہندوؤں اور خصوصاً مہاراشٹر کے بہادروں کے مردہ جذبات میں نئی امنگ پیدا کرنے کے لئے شیواجی اور عالمگیر کی مری ہوئی ہڈیوں کو اکھاڑنا شروع کیا، شیواجی کو قومی ہیرو بنایا گیا اور اس کے بالمقابل میں عالمگیر کو ہر ظلم اور ہر برائی کا مصدر ٹھہرایا گیا۔ واقعات گھڑے گئے، تاریخیں بنائی گئیں۔ جعلی تحریریں بنانے کے



کارخانے قائم کئے گئے، جھوٹے افسانے، ناٹک اور ناول لکھے گئے۔ ان کے دار الاشاعت قائم ہوئے، تھیٹروں اور تماشہ گاہوں میں ان کی نقلیں دکھائی گئیں اور یہ سلسلہ مراٹھی سے شروع ہو کر گجراتی اور بنگالی تک میں پھیل گیا اور اس زہریلے لٹریچر نے تمام ہندو نوجوانوں کے دل و دماغ کو مسموم کر دیا اور اس طرح ملک میں اب تک یہ نظام عمل پوری طرح قائم اور جاری ہے"۔ (بحوالہ حیات سلیمان ص ۲۲۶)

اس سے قبل اکتوبر ۱۹۲۲ء کے شذرات میں بھی ایک مراٹھی افسانہ نویس کی زہرناکی اور بہتان تراشی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔ سید صاحب نے بمبئی میں کھیلے جانے والے ان ناٹکوں پر بھی تبصرہ کیا جن میں بادشاہ اکبر کی ایک فرضی لڑکی مہرالنساء کو ایک راجپوت پر عاشق ہو جانے کی قیاسی داستان کو اسٹیج کیا جا رہا تھا۔ اس قبیل کی کہانیوں اور ناٹکوں پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"یورپین افسانہ نویسوں نے اس طریقۂ تحریر کے ذریعہ ترکوں کی اخلاقی اور خانگی زندگی کی یورپ میں بدترین تشہیر کی ہے اور اب اس قسم کا پروپگنڈا مسلمان سلاطین کے خلاف یورپین افسانہ نویسوں کے بہترین مقلد بنگالی، مراٹھی اور گجراتی افسانہ نویس پھیلا رہے ہیں۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ اس طریقے سے ملک یا علم کس کی خدمت انجام دے رہے ہیں"۔ (حیات سلیمان ص ۱۳-۳۱۲)

وہ شہر پونا جو سید صاحب کی عملی سرگرمیوں کے لئے مہمیز بنا تھا اور جسے فرطِ اکرام میں وہ "مرہٹوں کا صدر مقام اور مسٹر تلک کا "دار الحکومت" کہتے تھے۔ وہاں سے جب ایسی مسموم آندھیاں چلنے لگیں تو سید صاحب کو اس کا بڑا افسوس ہوا اور جذبات کی رَو میں اپنے دل کا بخار معارف کے شذرات میں اُتار دیا جو مہاراشٹر سے ان کے دلی لگاؤ کی

بین مثال ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی امت کی تنظیمی وحدت اور نظم ملت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے اس کے لئے سیاسی سطح پر خلافت، لیگ اور کانگریس کی تحریکوں کا سہارا لیا اور معاشرتی سطح پر جمعیۃ العلماء اور ندوۃ العلماء کا دامن پکڑا۔ نیز علمی سطح پر دارالمصنفین کے دارالاشاعت اور معارف کے شذرات کا سہارا لیا اور مسلمانوں کو ملی و قومی لحاظ سے امت محمدیہ کی چہاردہ صد سالہ بنیاد پر یکجا کرنے کے لئے دن رات سرگرم عمل رہے اور اسی کی کڑھن اور فکر میں اپنے شب و روز گذارتے رہے۔ وہ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے خواہ وہ ملک کے کسی بھی گوشے میں کیوں نہ ہو مہاراشٹر کے مسلمانوں کا ضرور خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ کے جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں مسائل امت کے جو نکات اپنی صدارتی تقریر میں پیش کئے وہ بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی تہذیبی، تمدنی و معاشرتی پس منظر میں تھے لیکن بمبئی کے مسلمانوں کی جاہلانہ رسوم کو بطور مثال خاص پیش کیا اور اس پر اپنے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"بمبئی کے بعض مسلمان قوموں میں ہندو قانون کی پیروی کس درجہ افسوسناک ہے لڑکیوں کو ان کے حق وراثت سے محروم رکھنا جاہلیت کا وہ طریق ہے جس کے مٹانے کے لئے سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ بمبئی کے کچھ میمنوں میں اور بعض دوسری قوموں میں افسوس ہے کہ اس جاہلیت کی رسم پر اب تک عمل درآمد ہے اور سب سے زیادہ یہ سن کر افسوس ہوا کہ پونہ کے بعض بنے ہوئے مولویوں نے ایسے ظالموں کی حمایت میں کچھ مسئلے گھڑے ہیں۔ انا للہ"۔ (بحوالہ حیات سلیمان ص ۲۴۹)

مولانا سید سلیمان ندوی میں دینی حمیت اور جذبۂ ایمانی فزوں تر تھے۔ وطن دوستی اور



اسلام پرستی میں ان کے یہاں تطبیق پائی جاتی تھی۔ لیکن جہاں کہیں اسلام پر حرف آیا اسلامی حمیت تمام اوامر پر غالب آجاتی تھی۔ ناگپور کے ڈاکٹر کیتکر (مراٹھی انسائیکلوپیڈیا کے لئے سید صاحب نے جن کی بہت تعریف کی تھی اور مسلمانوں کو ان کے اقدام سے غیرت دلائی تھی) نے جب یورپ کے پراگندہ ذہن ادیبوں کی تقلید میں حضورؐ کی شان میں توہین آمیز، نفرت انگیز اور سوقیانہ عبارت آرائی کو اپنی انسائیکلوپیڈیا میں جگہ دی تو مہاراشٹر کے مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ سید صاحب نے بھی کیتکر صاحب کے اس اقدام پر معارف کے شذرات (فروری ۱۹۲۶ء) میں اپنے رنج و افسوس کا اظہار کیا، جس سے ڈاکٹر کیتکر کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا اور انہوں نے ہتک آمیز عبارت کے صفحات جلد چہارم سے نکال لئے۔ ساتھ ہی سید صاحب کو ایک خط لکھا جس میں مراٹھی انسائیکلوپیڈیا کے اردو ترجمہ کی رغبت دلائی اور اشارۃً یہ بھی لکھ ڈالا کہ:

"ناظرین کو یہ بھی بتا دیجئے کہ اگر ڈیڑھ برس کے اندر اندر میں نہ دیکھ لوں گا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا کا بندوبست ہو رہا ہے تو میں خود اس کام کو شروع کر دوں گا" (حیات سلیمان ص ۳۲۰)

اس خط کو پڑھ کر سید صاحب کو ایک طرف کلی اطمینان ہو گیا تو دوسری طرف اردو انسائیکلوپیڈیا کے جذبہ نے دوبارہ ان کے دل میں کروٹ بدلی۔ معارف کے ۳۰-۱۹۲۶ء کے شذرات میں اس کی تفصیل ہمیں ملتی ہے۔ یہ قدم اب کسی "امیر کبیر" کی مالی امداد کے وعدے پر نہ اٹھا کر جمہور کے بھروسہ پر اٹھانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لیکن افسوس یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور انسائیکلوپیڈیا کا ارمان دل میں لے کر ہی عالم بقا کی طرف وہ روانہ ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندوی مارچ ۱۹۳۰ء میں بمبئی گورنمنٹ کے شعبۂ تعلیم کی ایما پر بمبئی تشریف لائے۔ یہاں "عربوں کی جہاز رانی" پر ان کو مقالہ خوانی کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ موضوع عربوں کے بحری اسفار کی گویا بین الاقوامی تاریخ پر مرتب ہونا تھا۔ سید صاحب کو تاریخ اسلام ہی نہیں تاریخ اقوام سے بھی خاص شغف تھا۔ اس لیے اس موضوع کی وسعت کا خیال رکھتے ہوئے اسی عنوان پر چار لکچر دئے جو بعد میں کتابی شکل میں شایع بھی ہوگئے۔ اس مقالے میں انہوں نے لغات العرب اور قرآن مجید سے عربوں کی بحری واقفیت اور جہازرانی کے تجربوں کے حوالے پیش کئے۔ اسلام کے ابتدائی دور کے علاوہ دور بنو امیہ، بنو عباسیہ، فاطمیینِ مصر اور بنی امیۂ اندلس کی بحری جنگوں کی تفصیل ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مغربی بندرگاہوں، افریقہ کے ساحلوں، بحر روم کے کناروں اور اس کے ساحلی ملکوں اور شمالی افریقہ میں عربوں کے بحری کارناموں کا ذکر ہے۔ دوسرے مقالے میں عربوں کی علمی سرگرمیاں، ان کے ایجادات و اکتشافات، عربوں کی سمندری معلومات، سمندروں کی پیمایش کے طریقوں، بحری نقشوں، لائٹ ہاؤس، ستاروں کی پہچان اور سمتوں کے تعین کا طریقہ وغیرہ کا بیان ہے۔ تیسرے مقالے میں عربوں کے آلاتِ جہازرانی پر سیر حاصل بحث ہے، اس میں عربوں کے جہاز بنانے کے کارخانے، ڈوبے ہوئے جہازوں کو نکالنے کے آلات، قطب نما کی ایجاد، ہواؤں کی کیفیت اور سمت معلوم کرنے کے لئے بادنما وغیرہ آلاتِ جہازرانی کی تفصیلات ہیں اور چوتھے مقالے میں عربوں کی بحر محیط کو عبور کرنے کی کوشش اور امریکہ تک ان کے پہنچنے کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں اور رسالوں کے حوالے بھی دئے گئے ہیں جو عربوں نے جہازرانی کے سلسلے میں لکھے تھے۔



مولانا سید سلیمان ندوی کو اس بات کا شدت سے صدمہ تھا کہ ہندوستان کی تاریخ کی درسی کتابوں کو مسموم کیا جارہا ہے اور اسے اس طرح مرتب کیا جارہا ہے کہ ایک فرقہ بدنام ہوجائے اور دوسرا فرقہ مظلوم ثابت ہوجائے۔ سید صاحب اس سم ناکی کا صفایا کرنے کے لئے تاریخ ہند کی تدوین کی کوشش کر رہے تھے کہ جس کے پڑھنے سے حقایق سامنے آجائیں اور کسی قوم یا فرقے کی دل شکنی بھی نہ ہونے پائے۔ ایسی تاریخ کے مرتب کرنے کے لئے معارف نومبر ۱۹۳۲ء کے شذرات میں جن ناموں کی فہرست دی ہے ان میں مہاراشٹر سے پروفیسر عبدالقادر دکن کالج پونا، پروفیسر نجیب اشرف ندوی اسمٰعیل کالج بمبئی اور پروفیسر محمد ابراہیم عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے نام نہایت اعتماد کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تا دمِ آخریں "مہاراشٹر" ان کے قلب و ذہن سے محو نہیں ہوسکا تھا۔

حسنِ اتفاق کہ اِدھر تاریخ ہند کی تدوین جدید کی فکر میں ہو رہی تھیں اور اُدھر مہاراشٹر میں زہرآلود فضا پھیلانے والی جعلی تاریخوں کا قدرت پردہ فاش کر رہی تھی۔ بسمت نگر ضلع پربھنی (دکن) حالیہ مہاراشٹر کے ایک بڑے مندر میں چوری ہوگئی۔ اس کے مہنت کے پاس عالمگیرؒ کی دی ہوئی ایک قیمتی پگڑی تھی جس میں جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ اور جس کی مالیت کا اندازہ اس وقت پندرہ (15) ہزار روپیہ تھا۔ یہ پگڑی سال میں ایک بار درشن کے لئے یاترا کے موقع پر مندر میں ایک مرصع تخت پر رکھ دی جاتی تھی۔ چوروں نے اس قیمتی پگڑی کی چوری کرلی تھی۔ پولیس کی تحقیقات میں چور اور مال سرقہ برآمد ہوگئے۔ پگڑی کے ساتھ چوروں کے پاس سے عالمگیر بادشاہ کی دی ہوئی کئی سندیں بھی دستیاب ہوئیں۔ اس خبر سے متاثر ہوکر سید صاحب تحریر فرماتے ہیں: "آج ہندو بھائیوں کی سیاسی اور تاریخی دنیا میں عالمگیر سے بڑھ کر کوئی بادشاہ بُرا نہیں مگر دیکھو کہ آج کتنے ہندو مندر ایسے ہیں جو اس بت خانۂ

شکن بادشاہ کی فیاضی کی بدولت آباد ہیں۔" اس جذباتی تحریر کے بعد موصوف نے درج بالا خبر کو شذرات کی سطور میں پیش کر دیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی ہندی / اردو کے مسئلے کے متعلق نہایت سنجیدگی سے غور کیا کرتے تھے۔ جوش کے بجائے ہوش اور اضطراب کے بجائے سکون سے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے تھے ایک طرف ہندی والوں کی باغیانہ روش تھی تو دوسری طرف سید صاحب کی سنجیدگی و متانت۔ انہوں نے اردو زبان کو بجائے "اردو" کہنے کے ہندوی یا ہندوستانی کہنے پر زور دیا اور تاریخ کے حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ "اردو" کا قدیم نام ہندی اور ہندوستانی ہی ہے۔ اس رائے پر اردو محاذ کے بعض سادے دانشوروں نے اعتراض کیا۔ دوسری طرف چندراولی پانڈے جیسے کٹر ہندی سمرتھکوں نے "ہندی اردو یا ہندوستانی" جیسے مضامین لکھ کر سید صاحب کی کھل کر مخالفت کی (دیکھئے ساہتیہ سمکشا نجلی آگرہ ص ۱۵۵) بالآخر سید صاحب کی دور اندیشی کو بھانپ کر ہندی والوں نے ناگپور کے جون ۱۹۳۶ء کے اجلاس میں ہندی اتھوا ہندوستانی کا نعرہ لگایا اور سید صاحب کے اردو کے لئے تجویز کردہ نام "ہندوستانی" کو ہندی سے جوڑ دیا ناگپور اجلاس کی یہ ضرب اردو والوں کے لئے اتنی کاری ثابت ہوئی کہ وہ آج تک مندمل نہ ہو سکی اور اردو اپنے وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئی۔ کاش کہ چند سنجیدہ دانشور اس وقت سید صاحب کا ساتھ دیتے۔

ناگپور اجلاس کے بعد اردو والوں نے ۲۴، ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو علی گڑھ میں راجہ محمود آباد کی صدارت میں اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب صدر استقبالیہ کی موجودگی میں تحفظ اردو کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا۔ انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخیں قائم ہوئیں لیکن ہندی اردو کا مسئلہ حل نہ ہونا تھا نہ ہوا اور اردو والوں کی



یہ تحریک سرد خانہ میں پڑی رہ گئی۔ اگرچہ یہ کانفرنس تنظیمی لحاظ سے کامیاب رہی لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج آج تک بھی برآمد نہیں ہوئے۔ ناگپور کے "ہندی اتھوا ہندوستانی" اجلاس سے متاثر ہو کر ہی سید صاحب علی گڑھ کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔

مولانا سید سلیمان ندوی مسلمانوں کا اسلامی تشخص، اسلامی تہذیب و تمدن اور اس کی قدیم روایات کی بقا کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے، جبکہ یہاں ایک مخصوص طبقہ مسلمانوں کو یہاں کے رنگ میں رنگ لینے کا خواہاں تھا اور اس کے لئے آئے دن نت نئے ہتھکنڈے استعمال کئے جا رہے تھے۔ "وردھا تعلیمی اسکیم" بھی مسلمانوں کے حق میں ایسا ہی سہر اجال تھا، جس کے مضر اثرات بہ دیر مرتب ہونے والے تھے۔ سید صاحب کو اس نظام تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں تھا لیکن مذہبی تعلیم کا اس میں کوئی نصاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ فکرمند بھی تھے۔ چنانچہ وردھا اسکیم کی افادیت کے ساتھ ہی اس کی نامذہبی پالیسی پر سید صاحب نے اپریل اور جولائی ۱۹۳۸ء کے معارف میں کھل کر اظہار خیال فرمایا:

"یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ ملک کی دوسری قومیں جو ناخواندگی کے عیب کو مٹا ڈالنے کے لئے کوشاں ہیں، وہ آپ کا انتظار کئے بغیر چل کھڑی ہوں گی اور کچھ دنوں کے بعد ہمارے اور ان کے درمیان فی صد خواندگی کا جو فرق ہو جائے گا وہ مٹائے نہ مٹے گا۔ اس لئے اس وقت مسلمان مذہبی تعلیم کو جبری تعلیم (وردھا اسکیم) سے رہائی پانے کا بہانہ نہ بنائیں بلکہ ایک عزم والی قوم کی طرح آئین اور مذہبی و ملکی دونوں فرضوں کو ایک ساتھ ادا کریں۔ ان میں سو فی صدی آدمی مذہبی تعلیم اور خواندگی دونوں حاصل کر کے دکھا دیں۔ یہ عزم کے سامنے مشکل نہیں۔" (بحوالہ حیات سلیمان ص ۴۶۳)

آگے جبری تعلیم کی نامذہبی پالیسی پر وہ رقمطراز ہیں:

"یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہا جاتا ہے کہ سرکاری تعلیم اور سیاسی معاملات میں مذہب کو دخل نہیں۔ آمنا وصدقنا، مگر پھر یہ کیا ہے کہ سیاسی و تعلیمی شعاروں میں ہندو مذہبی تخیل کی الوہیت کا ترانہ گایا جاتا ہے اور اس کے نشان بنائے جاتے ہیں۔ اب یا تو یہ کہہ دیا جائے کہ سراسر ہندو مذہبی تخیل تم کو (مسلمانوں کو) زبردستی قبول کرنا پڑے گا یا مشترکہ و متحدہ ہندوستان اپنے آپ ملکی شعار بنائے گا اور ملکی ترانے گائے گا۔" (ایضاً ص ۴۷۶)

اس طرح یو۔ پی میں رہتے ہوئے "وردھا اسکیم" کی تعلیمی پالیسی کے تحت مسلمانوں کے تشخص پر آنے والی آنچ کی گرمی کو سید صاحب نے محسوس کیا اور اس کے جو ممکنہ حل نکل سکتے تھے شذرات کے ذریعہ اپنے قومی بھائیوں تک پہنچا دئے۔

جنوری ۱۹۴۰ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کو دکن کا سفر پیش آیا۔ دوران سفر بمبئی اور پونا میں بھی قیام فرمایا اور یہاں کے علمی حلقوں میں اپنے خیالات کے موتی بکھیرے۔ بمبئی کے اسمٰعیل کالج اندھیری میں "ایمان و عمل قوم کے دو بازو" پر پہلی تقریر کی اور اسی کالج میں دوسری تقریر میں "مولد اردو" پر اپنے محققانہ خیالات کا اظہار فرمایا۔ بمبئی ہی میں تیسری تقریر انجمن اسلام میں اردو زبان کی وسعت و عالمگیریت پر ہوئی۔ یہ آخری دونوں تقریریں "نقوش سلیمانی" میں شایع ہو چکی ہیں۔ دوران سفر وہ پونا میں بھی ٹھہرے اور یہاں بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ اور بھارت اتہاس سمشودھن منڈل کو ملاحظہ فرمایا۔ اردو ٹریننگ کالج پونا میں مسلمانوں کے تحفظ پر اظہار خیال فرمایا اور خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مسلم کلچر کی تباہی پر افسوس کا اظہار کیا۔

اس سفر کے کم و بیش چار سال بعد ان کا دوبارہ دکن کا سفر ہوا۔ ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس دسمبر ۱۹۴۴ء میں انہوں نے شرکت فرمائی اور سفر سے واپسی میں جمعیۃ العلماء صوبۂ بمبئی کے اجلاس کی صدارت قبول کی۔ بمبئی کے اس اجلاس میں ان کا خطبۂ صدارت خالص



دینی تھا۔ اس میں سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کی روشنی میں مسلمانوں کو موجودہ حالت کا جائزہ لے کر لائحہ عمل بتایا۔ اسی جلسہ میں اہل بمبئی کو ایک عام اور آزاد مدرسہ کے قیام کی طرف توجہ دلائی۔ بمبئی کے مسلمانوں نے اس تجویز کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا اور چند مہینوں کے بعد ہی ان کے مبارک ہاتھوں سے اس کا سنگِ بنیاد رکھوایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۰ء بھوپال میں رہے لیکن یہاں بھی دارالمصنفین اور معارف کی فکر برابر ان کو دامن گیر رہا کرتی تھی۔ کتب خانۂ دارالمصنفین کو کمیاب و نایاب کتابوں سے مزین کرنے کی دھن آخر تک رہی۔ اس معاملہ میں بھی سرزمین مہاراشٹر نے ان کو مایوس نہیں کیا۔ ایک خط میں بھوپال سے لکھتے ہیں:

"نجیب اشرف صاحب نے بمبئی سے بذریعہ بیمہ رجسٹری ایک کتاب قلمی "اکبرنامہ" دارالمصنفین میں بھیجی ہے۔ وہ پہنچی یا نہیں مطلع کیجیے۔ اگر پہنچی ہو تو داخل کتب خانہ کیجیے اور اس کی قیمت سو روپے میرے حساب میں جمع کر دیجیے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی کا مہاراشٹر میں آخری سفر حج بیت اللہ سے واپسی پر ہوا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مہاراشٹر میں ان کی پہلی آمد سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ میں ہوئی تھی اور آخری آمد مناسک حج کی تکمیل کے بعد۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں سفر حج کے لئے روانہ ہوئے اور ۱۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو جدہ سے لوٹے۔ ایسی حالت میں کہ شدید بخار میں مبتلا تھے۔ بمبئی پہنچتے پہنچتے اتنے بیمار ہو گئے کہ سفر کے قابل نہیں رہے۔ اس لئے بمبئی میں دارالمصنفین کے شیدائی اعظم گڈھ کے منشی عبدالعزیز انصاری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا اور طبیعت کے سنبھلنے کے بعد جنوری ۱۹۵۰ء میں بھوپال تشریف لے گئے۔ اس طرح حج بیت اللہ سے واپسی سید صاحب کا مہاراشٹر میں آخری سفر ثابت ہوئی۔ اس کے بعد یہ سرزمین ان کے قدموں کو ترستی رہی۔

# کتاب الفخر

از ابو سفیان اصلاحی*

یہ ایک عربی مخطوطہ ہے جو پانچ قصائد اور ایک تہنیتی قصیدہ پر مشتمل ہے۔ یہ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری میں شعبۂ مخطوطات کے حبیب گنج کلکشن میں ۲۸/۱۵۵ نمبر کے تحت موجود ہے[۱] اور پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں مصنف کے ہاتھوں کا لکھا ہوا ہے، خط نہایت جلی اور واضح ہے۔ یہ ۳۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر پانچ اشعار ہیں، البتہ ہر فصل کے آغاز اور اختتام میں کہیں دو[۲] اشعار ہیں تو کہیں تین[۳] یا چار[۴] تاکہ ہر صفحہ پر پانچ اشعار کی قید برقرار رہے۔ تمام فصلیں سیاہ روشنائی سے ترتیب دی گئی ہیں۔ اس کا سبب تالیف نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی حیدرآباد دکن آمد ہے۔ وہ جب ۲۸ شعبان ۱۳۳۹ھ/۱۹۱۸ء کو حیدرآباد تشریف لے گئے[۵] تو نواب میر عثمان علی خاں (نظام دکن) نے انہیں بغیر کسی سفارش کے صدر الصدور کا عہدہ تفویض کیا[۶]۔ وہاں پر موصوف نے گوناگوں علمی، اصلاحی، معاشرتی، دینی، تعلیمی اور عدالتی خدمات انجام دیں۔ اسی لئے اپنی بارہ[۱۲] سالہ خدمات کے بعد جب ۱۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو حیدرآباد کو خیرباد کہہ رہے تھے[۷] تو نظام حیدرآباد نے یہ تاریخی کلمات فرمائے "مولانا میرے ساتھ بھی بندھے ہوئے ہیں ورنہ یہ صورت پیش نہ آتی[۸]۔ غرض اس مخطوطہ میں مولانا کی وہاں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں سترہ

* لکچرر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔



صفحات سادہ ہیں۔ مخطوطہ کے آغاز میں کتب خانہ (۱۳۱۶ھ) حبیب گنج ضلع علی گڑھ کی مہر ہے جس پر یہ قیمتی جملہ درج ہے "خیر جلیس فی الزمان کتاب" اور یہی کتاب کے آخری صفحہ پر بھی ہے۔

مخطوطہ کے مصنف کا نام ابو عبداللہ حبیب محسن خمور العلوی الحسینی الحضرمی ہے۔ مصنف کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ہوسکے، صاحب نزہۃ الخواطر نے حضرمی نسبت کے ان پانچ اشخاص کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلے شخص احمد بن عبداللہ حضرمی ہیں جو شافعی المسلک تھے، وہ پہلی بار ہندوستان میں اپنے ماموں شیخ جعفر صادق کے پاس آئے اور احمد آباد میں ایک عرصہ تک قیام پذیر رہ کر حیدرآباد دکن آگئے، وہ اپنے علم و فضل کی وجہ سے مشہور تھے قرآن وحدیث اور عربی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ نظم ونثر دونوں میں کمالات کے جوہر دکھائے۔ ۱۰۳۷ھ میں حیدرآباد میں ان کا انتقال ہوا اور انہیں قوت الاسلام مسجد کے صحن میں دفن کیا گیا[۹]۔

دوسرے صاحب الشیخ احمد بن علوی حضرمی ہیں، یہ بھی شافعی المسلک تھے، یہ فقہ وحدیث پر پوری دسترس حاصل کرنے کے بعد ہندوستان آئے اور یہاں سے حج بیت اللہ کی غرض سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہاں دوبارہ علوم وفنون کے حصول میں مشغول ہوگئے[۱۰]۔

تیسرے شخص شیخ احمد بن عمر حضرمی یمن کے شہر تریم میں پیدا ہوئے، علوم وفنون کی تحصیل کے لئے مختلف شہروں کی خاک چھانی اس کے بعد ہندوستان آئے۔ یہاں سے حج بیت اللہ کے لئے گئے اور دوبارہ ہندوستان واپس آئے اور پھر حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے اور اس کے بعد ہندوستان آکر دکن میں قیام کیا، ان کے فضل وکمال کا چرچا سُن کر سلطان عادل شاہ بیجاپوری نے انہیں اپنے مقربین میں شامل کیا[۱۱]۔

چوتھی شخصیت شیخ احمد بن محمد حضرمی کی ہے، ان کی شعر وادب پر گہری نظر تھی ۹۹۸ھ میں ہندوستان آئے تو اس کے بعض شہروں میں گھومے، اس کے بعد برہانپور آئے ۱۴ شوال بروز بدھ ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۲ء میں لاہور میں انتقال ہوا[۱۱]

پانچویں شخصیت شیخ عبداللہ بن علی حضرمی کی ہے یہ صاحب سلخ جمادی الاخریٰ ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء میں پیدا ہوئے اور شہر تریم میں پرورش پائی، انہوں نے اپنے وقت کے جید علماء سے استفادہ کیا، اس کے بعد ہندوستان آکر اپنے والد کے پاس قیام کیا۔ ۱۵/ ربیع الاول ۱۱۳۵ھ کو سورت میں ان کا انتقال ہوا[۱۲]

چھٹے صاحب عبداللہ بن علی بن محمد حضرمی ہیں، یہ بھی مسلکاً شافعی تھے اور طریقت سے جڑے ہوئے تھے۔ ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۸ء میں ولادت ہوئی اور ۴ ربیع الاول ۱۱۹۸ھ کو سورت میں انتقال ہوا[۱۳]

آئینۂ محاسن میں حضرمی نسبت کے ایک اور شخص مولوی سید عبداللہ بن احمد علوی حسینی حضرمی کا ذکر ہے۔ جنھوں نے ایک تہنیتی قصیدہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی خدمت اقدس میں پیش کیا تھا۔ جس کا مطلع اس طرح ہے۔

زهت الدكن في مرط الهنا    واكتست برد الحبور والسنا[۱۴]

(دکن نے قبائے ناز و فوقیت پہن لی ہے    لباس فخر اس کا غلبہ، عزت بنا ہوا ہے)

ہم نے حضرمی نسبت کے مذکورہ بالا اشخاص کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ اس سے مخطوطہ کے مصنف کے حالات پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے، مذکورہ بالا اشخاص کے تذکرہ سے مندرجۂ ذیل پانچ باتیں معلوم ہوتی ہیں (۱) مخطوطہ کے مصنف ابو عبداللہ حبیب محسن خمور علوی حسینی حضرمی کا تعلق یمن سے تھا (۲) ان کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے (۳) ان کا آبائی وطن



حضرموت کا شہر "تریم" ہے (۴) آغاز ہی سے اس خانوادے میں ایسے اشخاص گزرے ہیں جو اسلامی علوم وفنون اور شعر وادب میں غیر معمولی شہرت کے حامل تھے (۵) اس خاندان کے لوگ ہندوستان میں سورت، سہارنپور، حیدرآباد دکن اور لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور (۶) مسلکاً شافعی تھے۔

یہ تو واضح ہے کہ حضرمی کی نسبت مصنف کے وطن حضرموت کی جانب تھی لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے لوگ کیوں بار بار ہندوستان کا قصد کرتے رہے اس کا جواب دائرہ معارف اسلامیہ لاہور کے مندرجہ ذیل اقتباس میں ملتا ہے:

"حضرموت کے باشندے ہشیار اور محنتی ہیں اور اپنے ملک سے بہت الفت رکھتے ہیں لیکن اس ملک کے بڑھتے ہوئے افلاس سے تنگ آکر ان میں بہت سے ترک وطن کرکے بیرونی ملکوں میں روزی کے لئے جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ عرب کے تجارتی مرکزوں میں آج کل بہت سے حضرمی موجود ہیں جہاں وہ مزدوروں یا چھوٹے دکانداروں کی حیثیت سے کسب معاش کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مصر خصوصاً (سابق) برطانوی اور ولندیزی جزائر مشرق الہند میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جونہی ان کے پاس تھوڑا سا اثاثہ ہوتا ہے وہ اپنے ملک واپس چلے جاتے ہیں وہ بعض دفعہ بیس بیس سال کے بعد اپنے وطن واپس لوٹتے ہیں۔ وہ شافعی المذہب ہیں"[۱۵]

مخطوطہ کے دوسرے صفحہ پر اس کی فہرست اس طرح درج ہے۔

۱- آغاز تمہیدی کلمات سے ہوا ہے جس میں مخطوطہ کے سبب تالیف کا بیان ہے۔

۲- اس کے بعد وہ تہنیتی قصیدہ ہے جسے مصنف نے اپنی پہلی ملاقات بروز جمعہ جمادی الاول ۱۳۳۰ھ کو قلمبند کیا تھا۔

۳۔ خطبۂ کتاب۔

۴۔ مقدمہ میں شیخ الاسلام شیروانی صاحب کی نشوونما اور حصول تعلیم پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۵۔ فصل اول میں شیروانی صاحب کے زہد و تقوی، تبلیغ و ارشاد اور جود و سخا پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

۶۔ فصل ثانی میں موصوف کے عدل و انصاف کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

۷۔ فصل ثالث میں قوم اور وطن سے شیروانی صاحب کی غیر معمولی محبت زیر بحث آئی ہے۔

۸۔ فصل رابع میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ دوسرے بھی ان کی خوبیوں پر عمل پیرا ہوں۔

۹۔ فصل خامس میں ممدوح کی حیدرآباد تشریف آوری پر اٹھنے والے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

اس طرح یہ منظوم رسالہ پایہ اختتام کو پہنچتا ہے، تیسرے صفحے کا آغاز اس طرح ہے۔

"کتاب فخر الاسلام والزمان بمکارم مولانا السید حبیب الرحمن یتضمن تاریخ حیاۃ شیخ الاسلام والمسلمین وفخر الایمان والمؤمنین حضرۃ جناب العالم الربانی۔ سید حبیب الرحمن الشروانی من یوم میلادہ بسنۃ الی تاریخ نظم الکتاب ۱۳۳۷ھ۔

نظم العبد العاجز ابو عبد اللہ حبیب محسن خمور العلوی الحسینی الحضرمی والمقیم الآن بحیدرآباد دکن نامپلی۔ جمادی الاول سنہ ۱۳۳۷ھ"



اس کے بعد تمہیدی کلمات کا آغاز اس طرح ہوا۔

"احمدک اللھم علی نعمک التی لا تحصی عداً و کرمک الذی جل ان یحد لہ حداً"

اور یہ تمہیدی کلمات اس طرح اختتام کو پہنچتے ہیں۔

"ومسمیاً لھذا التاریخ المنظم والکتاب الذی اشیربان ینظم لفخر الاسلام والزمان بمکارم مولانا السید حبیب الرحمن وباللہ استعین وھو نعم المولا ونعم المعین وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین"

یہ تمہیدی کلمات پانچ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کے پہلے صفحہ پر آٹھ حواشی بھی درج ہیں۔ آغاز حمد باری تعالی سے ہوا ہے، پھر سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے پھول نچھاور کئے گئے ہیں۔ اسی میں صاحب مخطوطہ نے نواب صاحب ممدوح سے اپنی پہلی ملاقات اور اس تاثر کا ذکر کیا ہے کہ وہ اعلی صفات کے حامل ہیں اور ان کے یہی کریمانہ صفات اس نظم کی تقریب بنے۔

یہ تہنیتی قصیدہ ۳۸ اشعار پر مشتمل ہے جو "آئینہ محاسن" میں بھی شامل ہے[15]۔ یعنی اس کتاب کا یہی ایک ایسا قصیدہ ہے جو مطبوعہ ہے۔

سعدت ورب الکعبۃ بکرۃ جمعۃ ۔۔۔ بروّیا محیا من اقام برتبۃ

من المجد لم ترض سواہ ولم تزل ۔۔۔ لتلک سوی من صار کل الخلیقۃ

یقولون حقا واعترافا بانہ ۔۔۔ فرید باوصاف الکرام الحمیدۃ

وان التقی والعلم والحلم والھدی ۔۔۔ مع الجود والانصاف والقول بالتی

صفاة لمن فاق الکرام سماحة    وهدیاً وارشاداً الیٰ خیر ملة

وامرا بمعروف ونهیا لمنکر    وحیاً لاصل العلم من خیر امة

ونصر الدین المصطفیٰ من کنانة    بعلم واقدام وعزم وهمة

وخلقا یمانیا عظیما وعفة    ونسکا مع زهد وحسن طویة

قصیدے کا اختتام ان اشعار پر ہوا۔

ومن وده منذ ولقیت جنابه    غدًا وبدینی دینی غذای وکعبتی

وازکیٰ صلوة الله ثم سلامه    علیٰ من له روحی فداء ومهجتی

مع الآل والاصحاب ماقال محسن    سعدت ورب الکعبة بکرة جمعة

اس تہنیتی قصیدے کے بعد خطبۂ کتاب ہے جو ۲۴ اشعار پر مشتمل ہے جس کا آغاز یوں ہوا ہے۔

من بعد حمد الله والصلوٰة    علی الرسول الکامل الصفاة

محمد الطیب الاسماء    وافضل اصل الارض والسماء

والآل والصحب الکرام الاتقیاء    والعلماء الوارثین الانبیاء

اعلم هدیت للهدیٰ النافع    بانه بعد اللقاء الواقع

مذکورہ اشعار سے یہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ مصنف کے دل میں سرور کائنات، آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اور علمائے کرام سے محبت کا جذبہ کس قدر موج زن تھا۔

بشهرنا الجاری جمادی الاول    بالقرشی الهاشمی الافضل

قد عن للفقیر ان ینظما    مکارم المولا امام الکرما

اعنی الامام العالم الزمانی    المدعو الحبیب للرحمان

اس کا اختتام یوں ہوتا ہے۔



مقدما بنظمه مقدمة    ثم فصول تتلو المقدمة

وبعد هن للکتاب خاتمة    ونسأل الکریم حسن الخاتمة

اس کا مقدمہ بعنوان " فی میلاد شیخ الاسلام ونشوءه وتحصیله للعلوم اجمالا" ہے یعنی اس میں شروانی صاحب کی پیدائش، نشوونما اور حصول تعلیم کا تذکرہ ہے۔ اس مقدمہ کے مطلع کا صرف مصرع اول ملاحظہ ہو۔

اذان میلاد الحبیب العالما

اس کے بعد دو شعر اس طرح ہیں۔

فبشر الاسلام بالاقبال    والعلم بالاحیاء والاجلال

والعلماء بالقدر والاکرام    والفقراء بالرفد والانعام

اس کے بعد کے اشعار میں یہ بتایا گیا کہ انہوں نے ایک شریف گھرانے میں آنکھ کھولی، ان کا خاندان علم و فضل میں یکتائے روزگار اور حسب و نسب کے لحاظ سے بلند مقام پر فائز تھا۔ پانچ سال کی عمر میں جناب شیروانی صاحب نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ سات سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان کی ذہانت و لیاقت کا چرچا شروع ہو گیا۔ اسی عمر میں قرآن کریم ختم کیا اور جب بیس سال کے ہوئے تو وہ تمام علمی سوالات کے جوابات دے سکتے تھے۔ فقہ، تفسیر اور علم حدیث پر ان کی گہری نظر ہو گئی۔ اسی طرح علم نحو، تجوید، توحید اور لغت پر بھی انہیں دسترس حاصل تھی، علم سیاست، تاریخ اور علم ہیئت پر بھی ان کی اچھی نظر تھی۔ ان کے عدالتی فیصلوں سے ان کی انصاف پسندی اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ایک متقی، مبلغ، امام عادل، قوم کے شیدائی اور خیر کے راستوں کے مسافر تھے۔

مقدمہ کے بعد فصل اول کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں ان کے زہد و ورع، دعوت و

ارشاد اور جود و سخا کا ذکر ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

اما التقی و النسک للامام      کالروح للاجساد للانام

وکیف لا وھو یبیت قائما      وغالب الایام یغدو صائما

والحج والزکوۃ بعد الفصل      للفرض من دین اتی بالنفل

مذکورہ بالا اشعار میں یہ بتایا گیا ہے کہ ممدوح کے نزدیک تقویٰ روح کے مانند تھا۔ اکثر راتیں قیام میں گزرتیں۔ اکثر ایام روزے سے گزرتے، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد وہ نوافل کا اہتمام کرتے، حق کے ساتھی تھے، لوگوں کو دعوت خیر دیتے اور ہر چیز کا بغور جائزہ لینے کے بعد کوئی رائے قائم کرتے۔

وغایۃ التحقیق والتدقیق یا      اخا الھدی بان تاج الاتقیاء

وہ امراء و روساء کے مابین قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھے جاتے۔ انہیں دنیا کی رنگینیوں سے کوئی رغبت نہ تھی بلکہ آخرت میں ان کا دل ہمہ آن اٹکا رہتا۔

واللھو بالغرور والتکاثر      بالمال کالزوار للمقابر

وہ شہر کے لوگوں کو بھلائیوں کی طرف بلاتے اور ان سے گھلے ملے رہتے۔ مصنف نے اہل شہر میں صدر یار جنگ کی حیثیت کا تعین اس طرح کیا ہے۔

کالبدر یغنینا عن البیان      ظھورہ بسائر البلدان

شیروانی صاحب مکتب اور مسجد دونوں مقام پر ایک مجدد کی حیثیت سے نظر آتے اہل شہر اور اہل قریہ دونوں کو تلقین کرتے، وہ لوگوں کی حاجت روائی کرتے اور اہل علم کی تشنگی کو دور فرماتے، طلبہ کا خصوصی خیال رکھتے، ضیافت ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ یتامیٰ اور مساکین کی دستگیری کرتے۔ اس کا خاتمہ اس طرح ہوا۔



وھٰھنا اول فصل کملا      محققا مدققا مکملا

وشروع الثانی نستعین      بعونک اللھم یا معین

اس کے بعد دوسری فصل کا آغاز ہوتا ہے، اس میں ان کے عدل و انصاف کے ضمن میں عدالتی فیصلوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

والعدل والانصاف بالاحکام      اذا قضا بین ذوی الخصام

فدونک التفصیل فی ذا الفصل      للعدل مع انصافہ بالفصل

وھو ھدایۃ الرشد ان المرتضیٰ      حکماً اذا ما بین خصمین قضا

آگے اس فصل میں یہ بتایا گیا کہ وہ تمام فیصلے قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں صادر فرماتے۔ قیاس، استنباط اور اجماع سے بھی کام لیتے۔ اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے لوگوں میں معروف تھے۔

وکیف وھو واحد لا یعرف      ثان لہ فی العدل ممن تعرف

کبھی کبھی انہیں اپنے فیصلوں کی بنا پر دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا اور لوگوں کی ملامتیں سننی پڑتیں لیکن وہ اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ انصاف کو پیش نظر رکھتے، ان کے سامنے خلفائے راشدین کا طرز عمل ہوتا تھا۔

ولم یخف فی اللہ لوم لائم      اذا قضا بالحق فی المظالم

وکیف یخشی کامل الایمان      سوی العظیم القادر الرحمان

اس کا اختتام اس طرح ہوتا ہے۔

وثالث الفصول یاتی بعدہ      لکی یبین العلوی وحدہ

بلہ ولیس خیر رب العلوی      لہ معین والنیات النبوی

تیسری فصل کا عنوان " فی تحقیق شیخ الاسلام علی القوم والوطن" ہے یعنی ملک وملت کے سلسلے میں ان کی کیا خدمات رہی ہیں۔ اس فصل کا آغاز دیکھئے۔

بعونك اللهم ربی نبتدی — بنظم ما للمستقيم المهتدی

من الغضا والفضل والتحنن — علی جميع القوم ثم الوطن

فاعلم هديت ان ذا المكارم — منذ وا ميطعنه للتمايم

قوم وملک کے لئے ان کے دل میں بہت درد تھا۔ وہ اہل ملک سے حد درجہ محبت کرتے اور ان کے حوصلوں کو بلند کرنا چاہتے تھے نیز انہیں صراط مستقیم پر گامزن کرنے کے متمنی تھے، صدرالصدور کی شخصیت نے قدم قدم پر ارباب علم۔ طلبہ۔ اہل نفس اور مفلسین کا ساتھ دیا۔ بہت سے ایسے مواقع آئے کہ شیروانی صاحب نے راتیں جاگ کر گزاریں۔ اپنے علوم وفنون کو لوگوں کے لئے عام کر دیا۔ وہ دنیا کے علاوہ آخرت میں بھی قوم کے درجات کو بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ نیز عرب وعجم دونوں میں قوم کو نمایاں حیثیت سے دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے قوم کے لئے اپنی جیب خاص سے غیر معمولی دولت لٹائی۔

اس کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے۔

بذا اعنی ما اودعت بالکتاب — من حکم ونصح للاحباب

فهو بيان لصفاة الفاضل — وتحفة للادباء الافاضل

اس کے بعد چوتھی فصل کا عنوان " فی الاقتداء بسیرہ فی الخیر والهدی" ہے۔ یعنی اس میں نواب صاحب کی شخصیت کی اتباع پر ابھارا گیا ہے اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ صدر یار جنگ کی شخصیت حرز جاں بنا لینے کے لائق ہے کیونکہ وہ نیکیوں سے متصف ہے۔



قصیدہ نگار کا خیال ہے کہ نہ صرف ہندوستان اور دکن بلکہ عرب وعجم کے علماء کے لئے بھی ان کی ذات عالیہ لائق اتباع ہے۔ رہے غیر اہل علم تو ان کے دین ودنیا کی خیر اس میں ہے کہ ان کو اپنا ماوی وملجا تصور کریں، نوجوانوں کو ان کا درس حدیث بڑے غور سے سننے کی نوبت ہے، وہ مشکلات کا نہایت آسان حل پیش کرتے، ان کے علم وعمل کی بنیاد منہاج نبوت ہے۔ باطل عقائد اور گمراہ مذاہب سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی قصیدہ میں یہ بھی فرماتے ہیں۔

وفضله بکل ما قد سطرا — بالفضل کالصبح اذا ما اسفرا

وليس ما سطرت كلف او به — يصح حصر وسيرة اوهديه

اس کا اختتام اس طرح ہوا۔

واربع الفصول ثم فاحفظا — له للخامس قابل بالرضی

وهل ما عشت على الرسول — تنل رضاه الشافع المقبول

پانچویں فصل کا عنوان " يتضمن ذكر قدوم شيخ الاسلام الى بلد حيدرآباد دکن" ہے۔ یعنی اس میں شروانی صاحب کی حیدرآباد آمد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس فصل کا آغاز اس طرح ہوا۔

اعلم هديت انني ابين — بنظم هذا الفصل ما يبين

به قدوم الوافد المحترم — الی بلاد الدکن المنظم

وما لمولانا الامام الفاضل — من الوفا مع الامير العادل

اس قصیدے میں اس پہلو پر اظہار خیال کیا گیا ہے کہ موصوف کی علمی استعداد اور کامل دستگاہ کو دیکھتے ہوئے امیر المومنین میر عثمان علی خاں نے ان کو صدرالصدور جیسے

اہم منصب پر فائز کیا جس کو بربنائے اطاعت اور امت مسلمہ سے اپنے گہرے لگاؤ کے باعث قبول کیا تاکہ اس واسطے سے ملت اسلامیہ کی کچھ خدمت کرسکیں۔ بعض لوگوں کے اس خیال کی مدلل تردید کی ہے کہ انہوں نے جاہ پسندی اور مادی منفعت کے لئے منصب کو قبول کیا تھا۔ اس خیال کو رشک وحسد کا نتیجہ بتاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

ماقصد الملك النظامی ابداً الالامر فدع من حسدا

ومن اضاء الملك بالامام كما يضيئ البدر للانام

حیدرآباد میں بارہ سالہ قیام کی مدت میں لوگوں کے ان سے فیض یاب ہونے کا ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ بادشاہ، امرا، علمار، عوام اور دوسرے اہل زمانہ ان کے علم وفضل کے معترف اور شاہد ہیں، ان کی تصانیف بھی ان کے علمی رتبے کا بین ثبوت ہیں جن سے ان کی علمی، دینی اور ملی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔

انما شانه كالظاهر للناس البدر المنير الظاهر

دیگر خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قصیدہ کا اختتام اس پر کیا ہے۔

فاحفظه واحفظ ماله مزينة خاتمة مستحسنة وحسنة

گذشتہ سطور میں مخطوطہ کے مشمولات کا مفصل جائزہ لیا جاچکا ہے، جہاں تک اس کے معیار اور زبان وبیان وغیرہ کا تعلق ہے تو اس حیثیت سے وہ فروتر اور شاعری کے لحاظ سے معمولی درجے کا ہے۔ اس کی اصل اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ وہ شیروانی صاحب کی حیدرآباد دکن کی سرگرمیوں کے متعلق ایک قیمتی دستاویز ہے، اس سے ان کی سیرت وشخصیت کے علاوہ ریاست کے بعض امور ومعاملات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ شیروانی صاحب پر ابھی تک جو کتابیں اور تحریریں منظر عام پر آئی ہیں ان میں اس مخطوطہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس سے پہلے



مرتبہ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کے عدالتی فیصلوں کی وجہ سے نظام سے متوسل بعض لوگ ان کے شدید مخالف اور حاسد ہوگئے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام اور اس کے نصاب وغیرہ کی تیاری میں شروانی صاحب کی خدمات اظہر من الشمس ہیں، مگر یہ مخطوطہ اس کے ذکر سے خالی ہے جو اس کی ایک بڑی کمی ہے۔

## حواشی

[1] کتاب الفخر کے لئے دیکھئے: عربک مینسکرپٹ آف حبیب گنج کلکشن (مرتبہ: ایم۔ ایچ قیصر) مولانا آزاد لائبریری۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ ۲/۲۳۹ [2] صدر یار جنگ۔ مولوی شمس تبریز خاں۔ مکتبہ دار العلوم، ندوۃ العلمار، لکھنؤ ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۰۷ [3] فیض الباری۔ ڈاکٹر عبدالباری۔ خواجہ پریس۔ دہلی ۱۹۹۱ء۔ ص ۵، [4] صدر یار جنگ۔ ص ۱۹۵ [5] ایضاً ص ۱۹۵ [6] مصنف کے سوانح وحالات کے متعلق یہی رائے حامد علی خاں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے غیر مطبوعہ مقالہ "ARABI POETRY IN INDIA" میں کہی ہے [7] نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر۔ العلامہ الشریف عبدالحئی بن فخر الدین الحسنی۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدرآباد دکن۔ ہند۔ ۱۹۴۸ء۔ ۵/۵۵ [8] ایضاً۔ ۵/۵۹ [9] ایضاً۔ ۵/۶۱ [10] ایضاً۔ ۵/۶۵۔ ۶۶ [11] ایضاً۔ ۶/۱۶۴ [12] ایضاً ۶/۱۶۶۔ [13] آئینۂ محاسن۔ نفیس ولہن۔ مطبع اعظم جاہ۔ حیدرآباد دکن (بدون تاریخ) ۱/۳۶ [14] معجم البلدان یاقوت حموی۔ دار صادر، دار بیروت، بیروت ۱۹۵۶ء۔ ۲/۳۱۳۔ نیز حضر موت کے سلسلے میں دیکھئے: دائرۂ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب۔ طبع اول۔ لاہور ۱۹۷۳ء/ ۱۳/۳۱۴، نیز دیکھئے: المنجد فی الاعلام الطبعۃ العشرون، بیروت، ۱۹۸۶ء۔ ص ۱۹۲ [15] آئینۂ محاسن۔ ۱/۵۳۔ ۵۶۔

---

استفسار وجواب

# محمد بن عبداللہ قحطانی کون تھا؟

جناب ع. می خیرآبادی

نکھیم پور کھیری۔

سوال : محمد بن عبداللہ قحطانی کون تھا، جس نے ۱۹۷۹ء میں مہدویت کا دعوی کیا تھا اور خانۂ کعبہ کی بے حرمتی ہوئی تھی۔

معارف :- محمد بن عبداللہ قحطانی ایک سعودی نژاد خود ساختہ مہدی تھا، جس نے اپنے ہم نواؤں کی ایک جماعت تیار کرکے اچانک کچھ دنوں کے لئے مسجد حرام پر اپنا تسلط جمالیا تھا۔ پندرھویں صدی ہجری کے آغاز اور خانۂ کعبہ کے جوار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے دعوی مہدویت کیا، مگر درحقیقت اس کے آڑ میں حصول اقتدار اس کا اصل مقصود تھا۔ سعودی حکومت نے خانہ کعبہ کے تقدس واحترام کا مکمل پاس ولحاظ کرتے ہوئے اس باغی گروہ پر قابو حاصل کیا۔ اس کارروائی میں قحطانی مارا گیا اور اس کے کئی ساتھی بھی ہلاک ہوئے۔ بقیہ کو زندہ گرفتار کرلیا گیا اور علما کے فیصلہ وفتوی کے مطابق ان کو بھی قتل کردیا گیا۔ یہ واضح رہے کہ امام مہدی پُرامن طریقہ پر اسلامی نظام کا احیاء کریں گے اور بعض روایتوں کے مطابق غلبۂ حق کے بعد سات سال تک زندہ رہیں گے۔ اس لئے قحطانی کا دعوی مہدویت سراسر فریب اور مفسدانہ سازش تھی جس کو اللہ تعالی نے ناکام بنادیا۔

ع - ع -

---



وفیات

# شیخ علی طنطاوی

گزشتہ ماہ عربی زبان کے نامور ادیب، مشہور واعظ ومصلح علامہ شیخ علی طنطاوی کا انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

وہ کافی معمر اور ضعیف ہوچکے تھے، انتقال کے وقت ان کی عمر نوے برس سے متجاوز تھی، مسجد حرام میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور بلد حرام میں مدفون ہوئے۔

ان کی نسبت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا آبائی وطن طنطا مصر تھا، مگر وہ ایک مدت تک شام میں مقیم رہے اور وہاں منصب قضا پر بھی فائز رہے، شام میں فوجی انقلاب کے بعد غالباً وہ وہاں سے سعودیہ عربیہ منتقل ہوگئے اور عمر کا بقیہ حصہ یہیں بسر کیا۔

سعودی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ان کی مذہبی تقریریں اور علمی سوال وجواب کا سلسلہ کافی مقبول ہوا۔ وہ عربی کے بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے ان کے گہرے علمی روابط تھے، چنانچہ مولانا کی کئی کتابوں پر انہوں نے پیش لفظ لکھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے اور اس کے متعلق والہانہ جذبات کا اظہار کیا۔ ندوہ کے عربی رسالہ "البعث الاسلامی" میں ان کے مضامین برابر نقل کئے جاتے تھے۔

شیخ طنطاوی کا خاص مشن عرب نوجوانوں کی مذہبی اصلاح تھا، وہ خاص طور پر ان کو دینی حمیت وغیرت اور مغرب سے عدم مرعوبیت کی دعوت دیتے تھے، ان کی تقریروں اور تحریروں کے متعدد مجموعے شایع ہوچکے ہیں۔ اللہ تعالی ان کی خدمات کو قبول کرے اور

مغفرت فرمائے۔ آمین!!

## ڈاکٹر محمد مصطفےٰ زرقاء

گذشتہ دنوں عالم عرب کے ممتاز ماہر فقہ ڈاکٹر محمد مصطفےٰ زرقاء نے بھی اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔

ڈاکٹر صاحب اسلامی فقہ وقانون میں سند کا درجہ رکھتے تھے، ان کی کتاب المدخل الفقہی العام اصول فقہ میں نہایت بلند پایہ خیال کی جاتی اور مرجع و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ اپنی غیر معمولی فقہی بصیرت کی بنا پر شام میں وزیر انصاف کے عہدہ پر بھی فائز ہوئے۔ ان کے عالمانہ و محققانہ مضامین کے اردو رسالوں میں ترجمے برابر چھپتے رہتے تھے، معارف کو بھی ان کے مضامین کے ترجموں کی اشاعت کا فخر حاصل ہے۔ مجلہ البعث الاسلامی لکھنؤ میں ان کے متعدد مضامین شایع ہوئے ہیں۔ فقہ کے علاوہ دوسرے اسلامی علوم خصوصاً تفسیر و حدیث سے بھی ان کو خاص مناسبت تھی۔ الولد سر لابیہ کے مصداق ان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر محمد انس زرقا بھی فقہ اسلامی کے ممتاز اسکالر ہیں، جن کے بعض مضامین کا ترجمہ معارف میں شایع ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے۔ آمین!!

ع۔ ع۔

## جناب خلیل الرب صاحب

گذشتہ مہینے جناب خلیل الرب صاحب وفات پاگئے، وہ پھولپور (الٰہ آباد) کے رہنے والے تھے، محکمۂ تعلیمات میں ملازم تھے، اس سلسلے میں اعظم گڈھ برسوں قیام رہا، شبلی منزل برابر تشریف لاتے اور اردو سے عشق تھا۔ ادب و تنقید پر چند کتابیں بھی لکھیں، یوپی۔ اردو اکیڈمی اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے، باغبانی اور چمن آرائی کا عمدہ ذوق تھا، دار المصنفین کی گولڈن جبلی کے موقع پر ان ہی نے چمن بندی کی تھی جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے بہت پسند کیا تھا اور ان سے گلاب کی بعض قسمیں دہلی منگائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، آمین!!

"ض"



باب التقریظ والانتقاد

## رسالوں کے خاص نمبر

**سہ ماہی فکر اسلامی** (اشاعت خاص بیاد مولانا قاری صدیق احمد باندوی) مدیر جناب مولانا محمد اسعد قاسمی، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۲۶۸، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: مرکز دعوت و ارشاد، دار العلوم الاسلامیہ بستی، یوپی۔

مشہور عالم ربانی اور عارف باللہ بزرگ مولانا قاری صدیق احمد باندوی علم و عمل اور خدمت خلق میں نمونۂ سلف صالحین تھے، دو سال پہلے ان کا انتقال ہوا تو ان کی پاکیزہ اور مثالی زندگی کے متعلق کثرت سے مضامین اور تاثرات سپرد قلم کئے گئے، بعض رسائل نے خاص شمارے شایع کئے، ان میں زیر نظر خاص نمبر بھی شامل ہے جس میں معاصرین اور تلامذہ و مسترشدین کی بڑی موثر تحریریں یکجا کی گئی ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نہایت موثر تعزیتی تحریر کے علاوہ مولانا محمد زکریا سنبھلی کا مضمون قاری صاحب کی سیرت و کردار کا بڑا پر اثر بیان ہے۔ دوسرے ابواب میں بعض اہم رسالوں کی تعزیتی تحریریں اور نظمیں بھی شامل ہیں۔

**ماہنامہ ترجمان اوقاف** جنوبی ایشیا اوقاف سمینار نمبر، مدیر جناب ڈاکٹر اشفاق علی، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۵۰، قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے، سالانہ ۱۵۰ روپے، پتہ: دفتر ترجمان اوقاف ۴۶/۱۳۳۔ نظیر آباد، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۸۔

اسلام کے نظام اوقاف کی اہمیت وافادیت مسلم ہے لیکن موجودہ دور میں دین کے دیگر شعبوں کی طرح اس سے بڑی غفلت اور بے اعتنائی برتی گئی، حالانکہ ہندوستان میں اوقاف کی شکل میں مسلمانوں کے لئے ایسا راس المال موجود ہے جس کے ذریعہ اکثر مسائل بہ آسانی حل کئے جاسکتے ہیں لیکن شومی اعمال سے اب اصل مسئلہ خود ان اوقاف کے تحفظ وبقا کا ہے، یہ رسالہ اس لحاظ سے منفرد اور قدر کے قابل ہے کہ یہ خاص اوقاف کے مسائل اور ان کے حل کے پیش نظر جاری کیا گیا، گذشتہ دنوں دہلی میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجکیٹو اسٹڈیز کے زیر اہتمام جنوبی ایشیا میں وقف کی جائدادوں کے متعلق ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا، زیر نظر شمارہ میں اسی کی روداد اور اس میں پیش کئے گئے دو اہم مقالات شامل ہیں، پہلا مقالہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کا 'وقف فقہ اسلامی میں' کے عنوان سے ہے اور دوسرا اس رسالہ کے لائق مدیر کا 'معاشی ترقی میں اوقاف' کے موضوع پر ہے اس کے علاوہ اخبارات کے تاثرات بھی ہیں، اوقاف سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ یہ رسالہ عام مسلمانوں کے لئے بھی بڑا مفید اور کارآمد ہے، ایسے بامقصد رسائل کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔

**ہفتہ وار نقیب** مولانا سجاد نمبر، مدیر جناب عبدالرافع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۰۴، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: نقیب امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار

مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ بانی امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، بہار بلکہ پورے ہندوستان کے ان نامور علما میں تھے جن کی زندگی کا ہر لمحہ قوم وملت کی بہبودی وخیرخواہی کے لیے وقف تھا، علم وفضل اور کردار وعمل کی ایسی جامع تصویر خال خال نظر آتی ہے، ان کی شخصیت اور حیات وخدمات پر گذشتہ دنوں ایک سیمینار منعقد ہوا، یہ خصوصی شمارہ اسی موقع پر



شایع کیا گیا جس میں ان کے سوانح اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔

**ماہنامہ آموزگار** مدیر جناب اکبر رحمانی، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۳۲، قیمت سالانہ ۵۰ روپے، پتہ: آموزگار، جل گاؤں ۴۲۵۰۰۱۔

یہ ماہنامہ اپنے تعلیمی وتدریسی موضوعات کے لئے اب محتاج تعارف نہیں، عرصہ تک یہ بڑے سائز پر شایع ہوتا رہا، جس کی کتابت وطباعت زیادہ اچھی نہ تھی، اب اسے کتابی سائز پر عمدہ کتابت وطباعت سے مزین کیا گیا ہے اور ترتیب میں بھی بعض خوشگوار تبدیلیاں مثلاً سرورق پر اردو کے کسی ممتاز صاحب قلم کی تصویر وتعارف کا التزام کیا گیا ہے، اکبر رحمانی صاحب اردو کے ایسے مجاہد ہیں جن کے عزائم بلند اور فکر ہمیشہ مثبت ورجائی رہتی ہے، زیرنظر شمارہ میں بھی ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں... جب تک سانس ہے آموزگار کو زندہ رکھوں گا... بے حسی ایک نہ ایک دن ختم ہوکر رہے گی، حالات سے مایوس نہیں ہوں۔

اس کا تازہ شمارہ موصول ہوا جو اس لحاظ سے خاص ہے کہ اس میں فاضل مدیر کے ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۶ء تک کے اداریوں کو یکجا کیا گیا ہے، تعلیم وتدریس کے موضوع سے تعلق رکھنے والے اداریے یقیناً بڑے کارآمد اور استفادے کے لائق ہیں

**ششماہی اقبال ریویو** مطالعہ اقبال، آہنگ غالب کے پس منظر میں، مدیر جناب ڈاکٹر بیگ احساس، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۹۲، قیمت فی شمارہ ۳۰ روپے، سالانہ ۵۰ روپے، پتہ: دفتر اقبال اکیڈمی، مدینہ مینشن، نارائن گوڑہ حیدرآباد، ۵۰۰۰۲۹۔

اقبالیات کے متعلق اقبال ریویو کے مضامین قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس خصوصی شمارہ میں غالب واقبال کے تعلق سے چند اور عمدہ مضامین یکجا کئے گئے ہیں مثلاً

تنقید غالب میں اقبال کا حصہ، اقبال اور غالب کا تقابلی مطالعہ، غالب و اقبال کی مکتوب نگاری، اقبال کی صحبت میں ذکر غالب اور غالب اور اقبال غزل کے تناظر میں۔ ان مضامین کے انتخاب کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے موضوع کا تعارف بھی ہو اور عصری میلانات کی روشنی میں مزید مطالعہ کی فضا بن سکے، توقع ہے کہ یہ کوشش کامیاب ہوگی اور غالب اقبال کے شیدائیوں کے لئے اس شمارہ کا لطف دوبالا ہوگا۔

**المحقق** مدیر جناب ڈاکٹر عبدالخالق خاں، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۹۰، قیمت فی شمارہ ۴۰ روپے، سالانہ ۱۰۰ روپے، پتہ: سیرت اکیڈمی و انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، یونیورسٹی آف آزاد جموں اینڈ کشمیر میرپور کیمپس، آزاد کشمیر (پاکستان)۔

یہ نیا دینی و مذہبی رسالہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے عمل کو تیز تر کرنے اور اس کے لئے سرگرم تعاون پیش کرنے کی غرض سے نکالا گیا ہے، اس اولین شمارہ میں سیرت طیبہ کے متعلق تین اچھے مضامین کے علاوہ "ولادت اور رفع مسیحؑ کے متعلق اناجیل اور قرآن پاک کا تقابلی جائزہ" اور "حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے کارنامے" کے عنوان سے دو اور مضامین ہیں، تمام مضامین سے سنجیدگی اور جذبۂ اخلاص نمایاں ہے، خدا کرے رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو اور آیندہ اس کی ظاہری و معنوی خوبیوں میں بھی اضافہ ہو، البتہ اس شمارہ کی قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

**ماہنامہ دارالسلام** (خصوصی اشاعت نشان بندگی نماز) مدیر جناب طارق عمیر عثمانی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۸۰، قیمت ۱۴ روپے، سالانہ ۸۰ روپے، پتہ: ماہنامہ دارالسلام دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ، پنجاب ۱۴۸۰۲۳۔

مذہبی، تعلیمی اور اصلاحی موضوعات پر اس رسالہ میں موثر اور دلچسپ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، اس سے پہلے اس نے ایک خصوصی شمارہ "سیدھا راستہ" کے نام سے شائع



کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ اب نماز کے موضوع پر آسان اور عام فہم اسلوب و زبان میں نماز کا طریقہ، اس کے مسائل و احکام اور اس کی حکمت و مصلحت پر مشتمل مضامین سے متعلق یہ ایک اور خاص شمارہ ہے، جابجا تصویروں کے ذریعہ نماز کی صحیح ادائیگی کا طریقہ بھی واضح کیا گیا ہے جس سے اس کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے، امید ہے یہ نمبر بھی مقبول ہوگا۔

## نئے رسالے

**THE FRAGRANCE** مدیر جناب شارق علوی، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۹۹، قیمت فی شمارہ ۳۰ روپے، پتہ: ڈپارٹمنٹ آف جرنلزم اینڈ پبلسٹی، ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳، لکھنؤ، ۲۲۶۰۰۷۔

ندوۃ العلماء کے اشاعتی منصوبوں میں عربی اور اردو کے بعد اب انگریزی زبان کا یہ رسالہ بھی شامل ہوگیا ہے، جس کے پہلے شمارہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مضمون انسانی اتحاد و مساوات کے تصور کے علاوہ مذہب و سائنس کے جدید مسائل پر عمدہ مضامین ہیں، دعا ہے کہ اپنے نام کے مانند اس کی خوشبو ہر سو عام ہو۔

**مجلہ فیض محمود** مدیر جناب مولانا عبداللہ خالد قاسمی، قیمت فی شمارہ ۵ روپے سالانہ ۵۰ روپے، پتہ: جامعہ شرعیہ فیض العلوم، شیرواں عیدگاہ، سرائے میر، اعظم گڈھ۔

دینی و اصلاحی مضامین پر مشتمل مفید رسالہ ہے۔

## خصوصی مجلے

**میگزین شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج (۱۹۹۷-۹۸ء)** مدیر جناب ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۳۸۰، قیمت درج نہیں پتہ: اردو سیکشن، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڈھ یوپی ۲۷۶۰۰۱۔

شبلی کالج اعظم گڈھ کے شعبۂ اردو کے اس سالانہ مجلہ سے اس کی کارکردگی کا اندازہ ہوتا ہے، اساتذہ وطلبہ اور بعض دوسرے اہل قلم کی نگارشات میں تنوع ہے، علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کے علاوہ غالب، اقبال، فانی، مولانا آزاد اور مولانا امین احسن اصلاحی کے متعلق معیاری مضامین ہیں، اودھ پنچ کا ادبی وسماجی جائزہ اور غیر مسلموں سے اورنگ کے تعلقات اور قصبہ مبارکپور کی علمی وثقافتی اہمیت پر بھی عمدہ تحریریں ہیں، کالج کے سابق پرنسپل اور ادیب ونقاد میجر علی حماد عباسی مرحوم کی یاد میں ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی تحریر بھی ہے، حصۂ نظم بھی کم نہیں۔

**المنار** مدیر جناب اشفاق احمد، صفحات ۱۹۴، پتہ: ندوۃ الطلبۂ جامعہ سلفیہ، مرکزی دارالعلوم بنارس یوپی۔

جامعہ سلفیہ کے طلبہ کی انجمن ندوۃ الطلبہ کا یہ سالانہ مجلہ اس کی روایت کے مطابق اردو، عربی، ہندی اور انگریزی زبان میں صرف طلبہ کی تحریروں پر مشتمل ہے، عقائد، اسلامیات، شخصیات، ادیان وفرق اور سیاسیات وادبیات کے موضوعات پر ہونہار طلبہ کی محنت وکاوش اور ان کی استعداد وصلاحیت کا یہ خوبصورت آئینہ ہے، اس کے لئے طلبہ نیز ان کے اساتذہ مبارکباد کے لائق ہیں۔

**تہذیب** مدیر جناب جاوید اختر اشتیاق احمد، صفحات ۱۳۰، پتہ: انجمن تہذیب البیان، جامعہ عالیہ عربیہ، مئوناتھ بھنجن، یوپی۔

یہ سالانہ مجلہ ایک اور معروف درسگاہ کے طلبہ کی صلاحیتوں کا مظہر اور حوصلہ افزائی کا مستحق ہے، ان مجلوں سے مدارس کے انداز تعلیم وتربیت کا اندازہ ہوتا ہے جو یقیناً باعث شکر ومسرت ہے۔

ع۔ ص۔



## مطبوعات جدیدہ

**کچھ غالب کے بارے میں** از جناب قاضی عبدالودود مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات حصہ اول ۲۸۰، حصہ دوم ۲۹۴، مجموعی قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

'نام نیک رفتگاں ضایع مکن' کے احساس واہمیت کے پیش نظر خدابخش لائبریری نے مشاہیر کی تصنیفات، نادر تحریروں کے انتخاب اور بعض کمیاب ونایاب رسائل کے طبع جدید کا قابل قدر اہتمام کیا ہے، زیر نظر دونوں حصے بھی اسی سلسلہ کے ہیں جن میں نامور محقق ونقاد قاضی عبدالودود مرحوم کی غالب سے متعلق ان تمام تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے جو ان کے اور مجموعہ مضامین جہان غالب میں شامل نہ ہوسکی تھیں، اس طرح جہان غالب اور عیار غالب کے بعد اس اشاعت سے غالبیات کے بارے میں ان کی ہر تحریر محفوظ ومطبوع ہوگئی، غیر معمولی دیدہ ریزی، دقت نظر اور سخت محنت وکاوش قاضی صاحب کے مطالعہ وتحقیق کی نمایاں خوبیاں ہیں، اس خریطۂ جواہر میں بھی یہی اوصاف روشن ہیں، وہ شاعر غالب کے معترف تھے لیکن محقق غالب کے طرفدار نہیں تھے، قاطع برہان اور دساتیر کے متعلق اس مجموعہ کے متعدد مضامین کے آراء وخیالات کو اولیت وتقدم کا ایسا شرف حاصل ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس پر اضافہ نہیں کیا جاسکا، اس کے علاوہ غالب کے فارسی اردو کلام مکتوب نگاری، بعض معاصرین اور کتب غالبیات کے متعلق بھی مضامین ہیں اور خوب ہیں، البتہ مکتوب الیہول اور مجعولیت جیسے الفاظ اور بعض نامکمل جملوں پر نظر ٹھہرتی ہے،

مثلاً "میرے نزدیک اس میں شبہے کی بہت کم گنجایش ہے کہ یہ موبد خواہ وہ آذرکیوان کا بیٹا ہو یا نہ ہو" اس مبدا کی خبر نہیں ملتی۔

**ظہیر غازیپوری، شخص شخصیت شاعری** از جناب حنیف ترین، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۰۰، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: مکتبہ عارض ۳۴/۱۲، مادی پور، نئی دہلی۔ ۶۳۔

جناب ظہیر غازیپوری خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں، ان کے متعدد شعری مجموعے شایع ہوکر ارباب ذوق ونظر سے داد تحسین حاصل کرچکے ہیں، علامہ ابر احسنی گنوری سے تلمذ اور داغ اسکول سے وابستگی کے باوجود وہ جدید شعری رجحانات اور عصری لب ولہجہ سے بے نیاز نہیں، ان کی شاعری میں تاثیر اور تازگی کا سبب بھی قدیم وجدید کا متوازن امتزاج ہے، اہل نظر نے وقتاً فوقتاً ان کی شاعری پر اظہار خیال کیا، ایسی تمام بکھری تحریروں کو ان کے مخلص ومحب شاگرد رشید نے اس سلیقے سے زیر نظر کتاب میں یکجا کردیا کہ یہ قوس وقزح کی طرح رنگین وجاذب نظر بن گئی۔

**منتخب تعبیرات** از جناب مولوی محمد علاء الدین ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات ۱۹۰، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: مکتبہ ندویہ، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، ندوۃ العلماء لکھنو، ۲۲۶۰۰۷۔

عربی زبان وادب کا ذوق وملکہ حاصل ہونے اور عربی تحریر وگفتگو کی صلاحیت میں اضافہ کی غرض سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جواں سال فاضل واستاد نے عربی ضرب الامثال، محاورات، روزمرہ کے جملوں اور خبروں کی سرخیوں وغیرہ کا انتخاب اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ طالب علم کو مشق ومہارت کے علاوہ پاکیزہ اور بلند خیالات کی دولت بھی حاصل ہوجائے توقع ہے کہ اس قابل قدر کوشش کا فائدہ عام ہوگا۔

ع۔ ص۔